نومبر 2013، قیمت -/10

ماہنامہ

بچوں کی دنیا

دہلی

Monthly BACHON KI DUNIYA, New Delhi

دیوالی مبارک

ماہنامہ
بچوں کی دنیا
دہلی
Monthly BACHON KI DUNIYA, New Delhi

جلد:1 شمارہ:6 نومبر 2013

اس شمارے میں

مدیر کا خط	آپس کی باتیں	مدیر	2
نظم	یہ بچے	ظفر کمالی	3
دنیا کے مذہب	سکھ دھرم	نصرت ظہیر	4
بچوں کا دن	چاچا نہرو زندہ باد	ایم چیلاپتی راؤ	8
نظم	میری آواز سنو	کیفی اعظمی	12
مضمون	چاند پر انسان کے قدم	لیوکاس روٹو	13
	خوشیوں کا تہوار دیوالی	نعمان قیصر	16
نظمیں	جگنو بھائی	جاوید اکرم	18
	بڑھیا اور چڑیا کی کہانی	محمد طلحہ صدیقی	18
مضمون	فلسفی شاعر ڈاکٹر اقبال	جگن ناتھ آزاد	19
مضمون	پرندے کی فریاد	ڈاکٹر اقبال	22
لوک کہانیاں	مرغے کا شوربہ	عظیم اقبال	23
	دوٹھگ	خوشنودہ نیلوفر	25
	ہوشیار کسان	محمد طارق صدیقی	29
	لالچی شکاری	جی انیس احمد	30
نئی لوک کہانی	کامریڈ فرفر	ابرار احمد اعظمی	31
کامکس کہانیاں	ننھا بار بر، فائنل میچ	ترجمہ: سید مکرم نیاز	33
اس مہینے کی باتیں	نومبر	ادارہ	39
نانی کا صندوق	چالیس دینار اور سچ		45
نظم	انسان تھا پہلے بندر	شکیل بدایونی	48
آپ کے سوال	ڈاکٹر بقراط کے جواب	ادارہ	49
قسط وار ناول	اسّی دن کا سفر 6	جولز ورنے	52
کھیل کھلاڑی	فٹ بال	شبنم پروین	59
اردو ایس ایم ایس	اردو ایس ایم ایس	ادارہ	62
آپ کی باتیں	اردو فیس بک	بچوں کے پیغام	64

مدیر اعلیٰ: ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین

نائب مدیر: ڈاکٹر عبدالحی

اعزازی مدیر: نصرت ظہیر

ناشر اور طابع:
ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمہ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند
مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی-88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا
فیز-II، نئی دہلی-110020
مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

قیمت-/10 روپے، سالانہ -/100 روپے

■ اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

صدر دفتر
فروغ اردو بھون، اے (ایف سی) 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا
جسولہ، نئی دہلی-110025
فون: 49539000
شعبۂ ادارت 'بچوں کی دنیا': 49539011
ای میل
bachonkiduniya@ncpul.in
editor@ncpul.in
ویب سائٹ
http://www.urducouncil.nic.in

'بچوں کی دنیا' کی خریداری کے لیے چیک، ڈرافٹ یا منی آرڈر بنام NCPUL، شعبۂ فروخت کے پتہ پر بھیجیں اور وضاحت طلب امور کے لیے وہیں رابطہ فرمائیں

شعبۂ فروخت: فون: 26109746
ای میل: ncpulsaleunit@gmail.com
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم، نئی دہلی-110066
شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002
فون: 040-24415194

آپس کی باتیں!

ننھے ساتھیو، 'بچوں کی دنیا' کے لیے ہمیں بہت سے تعریفی خط ملتے رہتے ہیں۔ انھیں پڑھ کر ہمارا حوصلہ بڑھتا ہے۔ لیکن آج مجھے اردو کے بزرگ افسانہ نگار جناب رتن سنگھ کے خط میں لکھی ہوئی ایک بات رہ رہ کر یاد آرہی ہے۔ ان کی ایک کہانی آپ نے پچھلے ہی شمارے میں پڑھی ہے۔ اس سے پہلے ایک خط انھوں لکھا تھا جو ہم نے ستمبر کے شمارے میں چھاپا بھی تھا۔ خط کی ابتدا انھوں نے اس جملے سے کی تھی:

''...خدا کرے ہندوستان کے بچوں کی دنیا بھی 'بچوں کی دنیا' کے پہلے شمارے کی طرح ہی خوب صورت ہو جائے...''

بچوں کے لیے ایسی دردمندی رکھنے والے ایک بزرگ ادیب کی اس معصوم دعا پر دل کی گہرائیوں سے 'آمین' کی صدا بلند ہوتی ہے، لیکن نومبر کے اس مہینے میں جو کہ 'بچوں کے دن' (14 نومبر) کا بھی مہینہ ہے، جب وطنِ عزیز کے غریب، نادار اور محروم بچوں کی حالت پر نظر جاتی ہے اور ان کی تکلیفوں کا خیال آتا ہے تو دل سے ایک آہ بھی نکلتی ہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو (جن کا جنم دن ہی قوم کے بچوں کا دن ہے)، مولانا ابوالکلام آزاد (جن کے یوم پیدائش کو ہم 'یوم تعلیم' کے طور پر منانے لگے ہیں) اور محترمہ اندرا گاندھی جیسے ہمارے قومی رہنماؤں نے اور ڈاکٹر اقبال جیسے قومی شاعروں نے آپ لوگوں کی تعلیم و تربیت، کھیل کود اور صحت مند تفریح کی سہولتیں ہر طرف مہیا کرنے اور آپ کے روشن مستقبل کے بارے میں جو خواب دیکھے تھے وہ ابھی تک کہاں پورے ہوئے ہیں۔ جو منصوبے باندھے تھے ان میں سے کئی پر عمل ہوا ہے اور کئی پر ابھی ہمیں اور کام کرنا ہوگا۔ یہ ہمارے پیارے چاچا نہرو اور مولانا آزاد کی دور اندیشی تھی کہ انھوں نے آپ کی فلموں کے لیے چلڈرن فلم سوسائٹی بنائی، کتابوں کے لیے چلڈرنس بک ٹرسٹ قائم کیا گیا، ملک کے کئی شہروں میں پلانیٹیریم بنے تاکہ سورج چاند ستاروں کی گردشوں کو آپ ٹھیک طرح سمجھ سکیں اور سب بچوں میں سائنسی مزاج اور علم کا شعور پیدا ہو۔ پچھلے چند برسوں میں کچھ اور بھی ضروری کام ہوئے ہیں۔ غریب بچوں سے ہوٹلوں، کارخانوں وغیرہ میں جو مزدوری کرائی جاتی تھی اس کے خلاف سخت قانون بنایا گیا۔ سب کو پرائمری تعلیم مفت دینے کی اسکیمیں چلائی گئیں۔ بچوں کو بہتر تعلیم کا حق دیا گیا۔ غریب ماں باپ کو روزگار اور کم قیمت پر اناج دینے کے پروگرام چلائے گئے ہیں تاکہ انھیں بچوں سے مزدوری کرانے کی ضرورت ہی نہ پڑے اور بچوں کو ان کا بچپن واپس مل جائے۔ یہ سب ہوا ہے مگر منزل ابھی دور ہے۔

یہ اتفاق کی بات ہے کہ جن ہستیوں کا ذکر میں نے اوپر کیا ہے ان سبھی کی پیدائش نومبر کے مہینے میں ہوئی تھی۔ اس لیے دو خاص مضمون ہم تمھیں نہرو جی اور علامہ اقبال کے بارے میں پڑھوا رہے ہیں۔ اس مہینے، دیوالی بھی ہے اور گرونانک جینتی بھی۔ چنانچہ اس تعلق سے ایک مضمون آپ دیوالی پر پڑھیں گے اور ایک سکھ مذہب کے بارے میں۔ ان کے علاوہ دل چسپ کہانیاں، نظمیں، اور مزے مزے کی باتیں تو ہیں ہی۔ ایک سلسلہ ہم بچوں کی لکھی ہوئی منی کہانیوں اور مضامین کا بھی شروع کرنے جا رہے ہیں جس سے آپ کو خود بھی لکھنے کی مشق ہوگی۔ اور ہاں، ہم چاہتے ہیں کہ ایک سلسلہ آپ کی بنائی ہوئی ڈرائنگز Drawings کا بھی شروع کریں کہ پتہ نہیں کل کون آپ میں سے ایم ایف حسین یا امرتا شیر گل بن کر ابھر آئے۔

اچھا دوستو، اب اجازت دو۔ چلتے چلتے صرف ایک درخواست آپ سے کروں گا کہ اپنے آس پاس جس بچے کو بھی دکھی، غریب اور اداس پائیں اس کا خیال رکھیں اور دیکھیں کہ آپ اس کی تعلیم و تربیت اور دل جوئی کے لیے کیا کر سکتے ہیں! آپ کا

(ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین)

نظم

□ ظفر کمالی

یہ بچے

ذہانت کی عجب ہیں کان بچے
نہ سمجھو تم انھیں نادان بچے

بھری برسات میں فٹ بال کھیلیں
یہ ہوکر حال سے بے حال کھیلیں
کبھی سڑکوں پہ ٹھونکیں تال، کھیلیں
مچائیں شور سے بھونچال کھیلیں
کبھی آندھی کبھی طوفان بچے

کبھی ان کو شرافت سوجھتی ہے
شرافت میں ظرافت سوجھتی ہے
ظرافت سے شرارت سوجھتی ہے
شرارت کیا قیامت سوجھتی ہے
ہیں شیطانوں کے بھی شیطان بچے

ذرا سی بات پر جب روٹھ جائیں
خوشامد اچھے اچھوں سے کرائیں
بڑے بوڑھے انھیں آکر منائیں
مٹھائی دیکھتے ہی مسکرائیں
کتر لیں بھوت کے بھی کان بچے

دکھائیں روز اک تازہ قیامت
انھیں پر ختم دنیا کی ذہانت
نہیں ان کی حکومت یا وزارت
کریں لیکن دلوں پر بادشاہت
ہیں اپنے اپنے گھر سلطان بچے

یہ تاریکی میں گھر کی روشنی ہیں
یہ اپنے باپ ماں کی زندگی ہیں
یہی بچے دلوں کی تازگی ہیں
یہ اپنی قوم کی تابندگی ہیں
بڑھائیں ملک کی بھی شان بچے

یہی گائیں گے خوشیوں کا ترانہ
ہے ان کے پاس ہمت کا خزانہ
بنے گا جب حقیقت ہر فسانہ
انھی کے ہاتھ میں ہوگا زمانہ
چڑھیں گے ایک دن پروان بچے

بتائیں کیا تمھیں کیا کیا بنیں گے
یہ چاندی ہیں ابھی سونا بنیں گے
یہی دانا یہی بینا بنیں گے
یہ قطرے ہیں کبھی دریا بنیں گے
بڑے ہونے کو ہیں بلوان بچے

چڑھے گی ان کے خوابوں پر جوانی
قدم چومے گی آکر کامرانی
لکھیں گے یہ ترقی کی کہانی
گزاریں گے سنہری زندگانی

بنیں گے دیش کی پہچان بچے
نہ سمجھو تم انھیں نادان بچے

♦ ڈاکٹر ظفر کمالی، اسماعیل شہید ایم ایم کالج مل روڈ سیوان 841226 بہار

نصرت ظہیر

سکھ دھرم

ہمارے ملک کے اہم ترین مذہبوں میں سب سے نوعمر مذہب سکھ دھرم ہے جس کی بنیاد پندرہویں صدی میں پڑی اور جس کے ماننے والوں کی تعداد اگرچہ صرف تین کروڑ بتائی جاتی ہے لیکن یہ پوری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں اور اپنی وضع قطع سے عام طور پر سب سے الگ پہچانے جاتے ہیں۔ سکھ دھرم صرف ایک خدا کی عبادت کا سبق دینے والے مذہبوں monotheistic religion s میں شامل ہے اور پنجاب سے شروع ہونے والے اس مذہب کو آج دنیا کا پانچواں سب سے بڑا منظم Organised مذہب مانا جاتا ہے۔ کئی دوسرے مذہبوں کی طرح سکھ دھرم میں خدا کو وقت کی قید سے اوپر یعنی 'اکال' مانا گیا ہے جو ہمیشہ سے ہے ہمیشہ رہے گا۔ اس مذہب میں رنگ نسل اور ذات کو بھی کوئی اہمیت نہیں دی گئی ہے۔

حضرت بابا گرونانک دیو اِس مذہب کے بانی تھے۔ وہ 15 اپریل 1469 کو پیدا ہوئے جسے سکھ گروپرب کے طور پر مناتے ہیں۔ کارتک پورنیما کے دن پوری دنیا میں ان کا یوم ولادت منایا جاتا ہے جو کہ اکتوبر اور نومبر کی مختلف تاریخوں میں آتا ہے۔ اس سال 17 نومبر کو یہ دن منایا جائے گا جسے گرونانک جینتی کہتے ہیں۔ گرونانک جی کا جنم لاہور (پاکستان) کے نزدیک ننکانہ صاحب کے گاؤں رائے بھوئے دی تلونڈی میں ہوا۔ ان کے والد کا نام کلیان چند داس بیدی تھا جو مہتہ کالو کے نام سے مشہور تھے اور علاقہ کے مسلم زمیندار رائے بلار بھٹی کے یہاں پٹواری کے طور پر ملازم تھے۔ والدہ کا نام ترپتا تھا جنھیں احتراماً ماتا ترپتا کہتے ہیں۔ نانک دیو جی سے پانچ سال بڑی ان کی ایک بہن بھی تھیں جن کا نام بی بی نانکی تھا اور جو روحانیت میں یقین رکھتی تھیں۔ 24 ستمبر 1487 کو نانک دیو جی کی شادی، (ماتا) سلکھنی جی سے ہوئی۔ ان کے دو بیٹے ہوئے۔ سری چند اور لکھمی چند۔ مسلم زمیندار رائے بلار بھٹی اور بی بی نانکی وہ پہلے دو شخص ہیں جنھیں اس وقت سب سے پہلے نانک دیو جی کی روحانی خوبیوں کا احساس ہوا جب وہ لڑکے تھے۔ انھوں نے ہی نانک دیو جی کو تعلیم حاصل کرنے اور دور دراز کے مقامات کے سفر پر جانے کو اکسایا بھی اور مدد بھی کی۔ کہتے ہیں کہ جب وہ مکتب میں الف بے تے سیکھ رہے تو الف کے حرف کی انھوں نے ایسی تشریح کی کہ استاد بھی حیران رہ گئے۔ انھوں نے کہا کہ فارسی یا عربی میں الف جس طرح لکھا جاتا ہے حساب (علم ریاضی) میں وہ ایک کے ہندسے کی طرح ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ خدا بھی ایک ہے۔ سکھ روایات بتاتی ہیں کہ 1499 کے آس پاس 30 سال کی عمر میں ایک صبح وہ اچانک لاپتہ ہوگئے۔ ان کے کپڑے ایک مقامی ندی کے نزدیک پڑے ہوئے ملے۔ قصبے کے لوگوں نے سمجھا کہ وہ ندی میں ڈوب گئے ہیں۔ لاہور

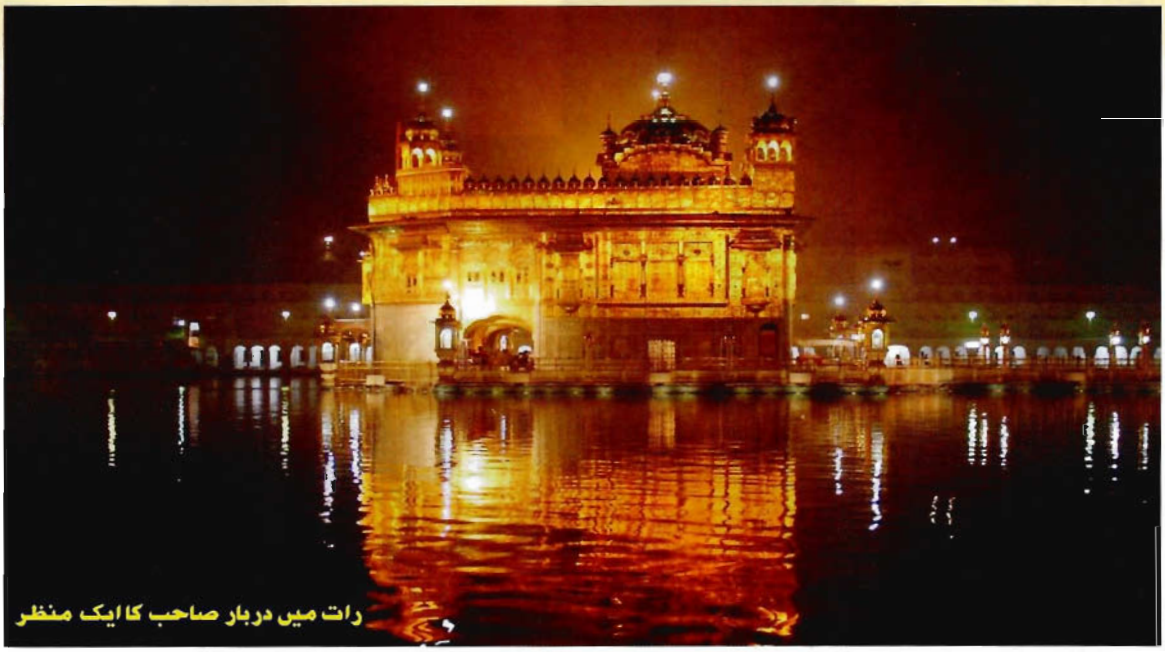
رات میں دربار صاحب کا ایک منظر

کے صوبہ دار دولت خان لودھی نے جس کے یہاں بی بی نانکی کے شوہر جے رام ملازم تھے، ندی میں کافی تلاش کرایا لیکن نانک دیو جی زندہ یا مردہ حالت میں کہیں نہیں ملے۔ لاپتہ ہونے کے تیسرے دن وہ اچانک سامنے آ گئے، لیکن کسی سے کچھ نہیں بولے۔ اگلے دن انھوں نے جو کچھ سب کے سامنے کہا وہ کچھ یوں تھا:

''نہ کوئی ہندو ہے نہ مسلمان۔ تو میں کس کی راہ چلوں؟ میں خدا کی راہ پر چلوں گا۔ خدا نہ ہندو ہے نہ مسلمان، اور جس راستے پر میں چلوں گا وہ خدا کا راستہ ہے۔'' یہی وہ لمحہ تھا جس سے سکھوں کے عقیدے کے مطابق سکھ دھرم کا آغاز ہوا۔ اور تبھی سے انھیں گرو مانا جاتا ہے۔ انھوں نے ملک اور ملک کے باہر ہزاروں میل کے سفر کیے جن کا ذکر کئی کتابوں میں ہے۔ مانا جاتا ہے کہ وہ ہندوستان میں آسام، اروناچل پردیش، بہار، بنگال کشمیر، لداخ وغیرہ گئے اور اس کے علاوہ سری لنکا، بھوٹان، تبت، سکم، نیپال، تاش قند، بغداد، مکہ، مدینہ اور جزیرہ نما Peninsula عرب کے کئی اور مقامات کا بھی انھوں نے سفر کیا۔ وہ چاروں سمتوں میں گئے۔ زیادہ تر پیدل سفر کیا اور بھائی مردانہ جو مسلمان تھے اور ان کے پہلے چیلے بنے تھے، اکثر ان کے ساتھ رہتے تھے۔ کل ملا کر ان کی زندگی کے 24 سال سفر میں گزرے۔ 22 ستمبر 1539 کو 70 سال کی عمر میں وفات پانے سے پہلے انھوں نے بھائی لہنا کو اپنا جانشین مقرر کیا جو گرو انگد کہلائے۔ ان کے بعد ترتیب وار گرو امرداس، گرو رام داس، گرو ارجن دیو، گرو ہرگوبند، گرو ہر رائے، گرو ہرکشن، گرو تیغ بہادر اور آخر میں گرو گوبند سنگھ اس سلسلے کے دسویں گرو کہلائے۔ کل ملا کر سکھوں کے گیارہ گرو ہیں جن میں ایک ان کی مقدس مذہبی کتاب گرو گرنتھ صاحب ہے، جسے زندہ روحانی گرو کا درجہ دیا گیا ہے چنانچہ اس کا کسی زندہ گرو کی ہی طرح احترام کیا جاتا ہے، اور عبادت گاہوں و گھروں میں اسے نہ صرف پنکھا جھلتے ہیں بلکہ سردی گرمی جیسی موسمی تبدیلیوں میں بھی اس کا کسی زندہ گرو اور بزرگ انسان کی طرح خیال رکھتے ہیں۔ یہ اپنے آپ میں ایک منفرد مذہبی صحیفہ ہے جس میں ابتدائی پانچ گروؤں کی کہی ہوئی باتوں کے علاوہ 15 دوسرے عظیم صوفی سنتوں اور بھگتوں کے قول شامل ہیں اور ان 15 ہستیوں میں مسلمان اور ہندو صوفی سنت بھی تھے۔ چنانچہ اس میں بابا شیخ فرید گنج

گردواروں کا فرش دھوتے ہوئے سکھ

شکرؒ، سنت کبیر اور سورداس کا کلام بھی ملتا ہے۔ یہ اقوال یا 'شبد' پنجابی، برج بھاشا، کھڑی بولی، سنسکرت اور فارسی زبانوں کے علاوہ اس زبان میں بھی ہیں جسے سنتوں کی بھاشا کہا جاتا ہے۔ پانچویں گرو، گرو ارجن نے اس مقدس کتاب کو ترتیب دیا تھا اور اسے آدی گرنتھ کہا جاتا ہے۔ چھٹے ساتویں اور آٹھویں گرو نے مذہبی مناجاتیں نہیں لکھیں لیکن 9ویں گرو نے لکھیں اور دسویں گرو گوبند سنگھ جی نے گرو تیغ بہادر کی ان مناجاتوں کو آدی گرنتھ صاحب میں شامل کرلیا اور اسے گرو گرنتھ صاحب کا نام دیا گیا۔ خود دسویں گرو نے اپنی تحریریں ایک الگ کتاب میں شامل کیں جسے دسم گرنتھ صاحب کہا جاتا ہے۔ گرو گرنتھ صاحب کو گرمکھی رسم الخط میں لکھا گیا جس کی ایجاد گرو انگد نے کی تھی۔ گردواروں میں اس کتاب کی تلاوت باقاعدہ موسیقی کے راگوں ہوتی ہے اور تلاوت کرنے والوں کو راگی کہا جاتا ہے۔ راگوں میں راگ سری، راگ گوری، راگ بہاگ، توڑی، بلاول، گونڈ، رام کلی، کدارہ، بھیرو، بسنت، سارنگ، ملہار، کانہڑا، کلیان، جے جے ونتی وغیرہ راگ شامل ہیں۔

سکھ مذہب کے بانی تو گرو نانک دیو جی ہی تھے لیکن یہ دسویں گرو جی مہاراج تھے جنھوں نے خالصہ کی بنیاد رکھی۔ دراصل پوری سکھ قوم ہی خالصہ ہے۔ اس کے بعد ہی سکھوں کے نام میں لفظ 'سنگھ' لازمی طور پر شامل کیا جانے لگا اور عورتوں کے نام میں کور ملا لیا گیا۔

13 اپریل 1699 کو ایک تاریخی دیوان یعنی جلسہ ہوا جس میں گرو گوبند سنگھ نے پانچ سکھوں کو 'پنج پیارے' کا نام دیا اور ان پانچ پیاروں کو خالصہ میں مرکزی حیثیت دی گئی۔ سکھ ایک طرح 'سنت کا سپاہی' ہوتا ہے۔ پانچ ککارے سکھ کے لیے بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ یہ ہیں، کیش (بال) کنگھا، کڑا، کچھا (نیکر) اور کرپان (خنجر)۔ سکھ اپنے بال نہیں کٹاتے۔ حقہ پینا یا تمباکو نوشی سکھوں میں منع ہے۔ سکھ گوشت خور بھی ہوتے ہیں لیکن وہ جھٹکے کا یعنی اس جانور کا ہی گوشت کھاتے ہیں جسے دھیرے دھیرے نہیں بلکہ جھٹکے سے کاٹا گیا ہو۔

سکھوں کی سب سے اہم عبادت گاہ امرتسر میں ہے جسے دربار صاحب یا ہرمندر صاحب کہتے ہیں۔ گنبد وغیرہ پر سونے کا پتر چڑھا ہونے کی وجہ سے اسے ہندی میں سورن مندر اور انگریزی میں گولڈن ٹیمپل کہا جاتا ہے۔ دربار صاحب

بغداد میں ملے اس کتبے کا عکس جو گرو نانک جی کی عرب سے واپسی پر شہر میں رکنے کے مقام پر بنے گردوارے کے باہر لگایا گیا اور جس میں ان کا ذکر حضرت بابا نانک فقیر کے لقب سے ہوا ہے۔ یہ گردوارہ عراق پر امریکی حملے میں تباہ ہو گیا تھا اور کہا جاتا ہے کہ وہاں کی حکومت نے اسے دوبارہ بنانے کا وعدہ کیا ہے

گردوارے میں لنگر کا ایک منظر

اور دیگر گوردواروں کی بناوٹ میں ہندوستان کے اسلامی طرز تعمیر کا گہرا اثر پایا جاتا ہے۔ دربار صاحب کی تعمیر کا منصوبہ گرو امرداس جی نے بنایا تھا مگر اسے عملی شکل گرو رام داس جی نے دی۔ انھوں نے اس مقام پر جہاں آج امرتسر ہے ایک بڑا تالاب کھدوایا۔ جب پانی بھر گیا تو اسے 'امرت سر' یعنی آب حیات کا تالاب کہا گیا۔ یہ سب کام 1577 میں مکمل ہوا۔ کہتے ہیں کہ مغل بادشاہ اکبر تیسرے گرو، گرو امرداس جی سے ملنے گیا تھا تو گرو کے علاقے میں رہنے والوں کی سادگی سے اتنا متاثر ہوا کہ اس نے گرو جی کی بیٹی کو بھائی جیٹھا سے شادی کے تحفے میں ایک بڑی جاگیر دے دی۔ بھائی جیٹھا بعد میں چوتھے گرو بنے اور گرو رام داس کہلائے۔ 1588 میں پانچویں گرو، گرو ارجن دیو نے بڑے پیمانے پر دربار صاحب کی تعمیر شروع کرائی اور اس کا سنگ بنیاد لاہور کے ایک مسلمان صوفی حضرت میاں میر جی سے رکھوایا۔ 1601 میں چار دروازوں والا یہ عظیم مندر بن کر تیار ہوا اور سکھوں کا اپنا ایک تیرتھ استھان بن گیا۔ سکھوں کے مسلمان بادشاہوں سے بڑے اچھے تعلقات رہے لیکن بادشاہ جہانگیر اور سخت گیر اورنگ زیب کی حکومتوں نے ان تعلقات کو بڑی ٹھیس پہنچائی۔

سکھ دھرم میں سچائی اور سب کی بھلائی کو سب سے زیادہ اہمیت دی گئی ہے، جھاڑ پھونک اور رسموں سے روکا گیا ہے، ستی ہونے یا جانور کی قربانی دینا منع ہے، بت پرستی یا قبر پرستی کرنے اور پاکیزگی کے لیے بھوکے رہنے پر پابندی ہے۔ سکھ اپنی قوم کے لوگوں اور اپنی عبادت گاہوں کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ وہ چاہے امیر ہوں یا غریب گردواروں میں ان کی حیثیت ایک جیسی ہوتی ہے۔ سب ایک جیسا پرساد یعنی تبرک نوش کرتے ہیں جسے 'کڑاہ پرساد'۔ آپ اکثر دیکھ سکتے ہیں کہ راتوں میں جب گرودواروں کی صفائی ہوتی ہے تو سکھ اپنی شاندار کاروں سے اترتے ہیں، اور سردی ہو یا گرمی پانی کی بالٹیاں لے کر گردوارے کے فرش کو ہاتھوں سے دھوتے ہوئے اس کارسیوا میں حصہ لیتے ہیں۔ تقریباً ہر گرودوارے میں لنگر یا بھنڈارہ لگتا ہے جس میں کوئی بھی شخص چاہے اس کا جو بھی مذہب یا ذات ہو، آکر مفت کھانا کھا سکتا ہے۔ تاہم اس میں گوشت پر پابندی ہوتی ہے تاکہ ہر مذہب کے لوگ لنگر کھا سکیں۔ گرمیوں میں سکھ اپنے مقدس دنوں میں شربت کی سبیلیں لگاتے ہیں اور دوڑ دوڑ کر راہگیروں کی پیاس بجھاتے ہیں۔ سکھ دھرم کے زیادہ تر ماننے والے چونکہ پنجاب سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے علاقے کی تہذیب کی مناسبت سے (جو مسلمان پنجابیوں میں بھی پائی جاتی ہے) اکثر سکھ بڑے جوشیلے، ملن سار، بے تکلف، مہمان نواز، زندہ دل، محنتی اور جفاکش ہوتے ہیں۔ □

♦ نصرت ظہیر، فروغ اردو بھون جسولا انسٹی ٹیوشنل ایریا، نئی دہلی 110025

□ایم چیلا پتی راؤ

چاچا نہرو زندہ باد

جواہر لال نہرو نے ہندوستانی بچوں کے نام اپنے ایک خط میں لکھا تھا کہ اگر تم میرے ساتھ ہوتے تو میں تم سے اس خوب صورت دنیا کے بارے میں خوب باتیں کرتا۔ اس دنیا کے پھولوں، درختوں، چڑیوں، جانوروں، ستاروں، پہاڑوں، گلیشیروں اور اس طرح کی دوسری خوب صورت چیزوں کی باتیں جو کہ ہمارے چاروں طرف پھیلی ہوئی ہیں۔ انھوں نے لکھا: ''تم نے پریوں کی بہت سی کہانیاں پڑھی ہوں گی، لیکن ہماری یہ دنیا خود، پریوں کی ایک بہت بڑی کہانی اور ایڈونچر کی داستان ہے، جو اب تک لکھی جا چکی ہے۔ ہمارے پاس صرف دیکھنے والی آنکھیں، سننے والے کان اور ایسا دماغ ہونا چاہیے جو باہر کی طرف کھلے اور دنیا کی خوب صورتی کا نظارہ کر سکے۔''

دنیا اور اس میں رہنے والے انسانوں کے بارے میں ہمارے چاچا نہرو کی سوچ بہت پھیلی ہوئی تھی۔ بچوں کے ساتھ بیٹھتے ہی گلاب کی طرح کھل اٹھنے والے ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم جواہر لال کی 124 ویں سال گرہ کے موقع پر اُن کے بارے میں آج ہم تمھیں ایک ایسے شخص کی تحریریں پڑھوا رہے ہیں جن کا نہرو بے حد احترام کرتے تھے۔ یہ تھے ایم چیلا پتی راؤ۔ آزادی سے پہلے نہرو جی کے شروع کئے ہوئے انگریزی اخبار نیشنل ہیرالڈ کے ایڈیٹر، جنھیں انھوں نے وزیر اعظم بننے کے بعد اخبار کی ذمہ داری سونپ دی تھی۔ چیلا پتی راؤ بڑے ایمان دار اور بے باک انسان تھے اور وزیر اعظم بننے کے باوجود نہرو اُن سے ڈرتے رہتے تھے کہ پتہ نہیں کس بات پر اُن سے ناراض ہو جائیں۔ ایسے خوددار تھے چیلا پتی راؤ اور ایسے پیارے تھے ہمارے چاچا نہرو جن میں ذرا سا بھی گھمنڈ نہیں تھا۔ مدیر

جواہر لال نہرو دنیا کے عظیم انسانوں میں سے ایک تھے۔ وہ بہادر مہربان اور شریف تھے۔ اپنی 75 سال کی زندگی میں انھوں نے سخت محنت کی اور ڈر کو اپنے پاس نہیں آنے دیا۔ وہ امیر خاندان میں پیدا ہوئے۔ لیکن ایک معمولی آدمی کی طرح زندگی بسر کی۔ بہت لمبے عرصے تک انھوں نے ملک کی آزادی کی لڑائی لڑی جس میں مہاتما گاندھی ان کے خاص رہنما تھے۔ ان کا کام ہندوستان کو مضبوط اور خوش حال بنانا تھا۔

انھوں نے مختلف نسلوں، فرقوں اور طبقوں کو آپس میں جوڑنے کا کام کیا۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے دنیا میں امن قائم کرنے اور اور قوموں کے درمیان اتحاد قائم کرنے کے لیے سخت محنت کی۔ انھوں نے اپنی آخری سانس تک یہ سب کام کیے اور کام کرتے ہوئے ہی انھوں نے آنکھیں موند لیں۔ انھوں نے اپنی پوری زندگی میں اپنے لوگوں سے بے انتہا پیار کیا اور جواب میں ان کو بھی اپنے لوگوں کا پیار ملا۔ وہ بچوں کو خاص طور پر چاہتے تھے اور بچے بھی ان کو پیار سے 'چاچا نہرو' کہنے لگے تھے۔ ان کی زندگی کی کہانی، شرافت اور انسانیت کی کہانی ہے۔

جواہر لال نہرو 14 نومبر 1889 کو الہ آباد میں پیدا ہوئے تھے۔ اب اس دن کو 'بچوں کے دن' Children's Day کے طور منایا جاتا ہے۔ ان کے والد موتی لال نہرو ایک مشہور اور خوش حال وکیل تھے۔ ان کی ماں کا نام سروپ رانی تھا جو ایک خوب صورت اور گڑیا جیسے چہرے کی خوش دل خاتون تھیں۔ جواہر لال نہرو کی پرورش انگریز لڑکوں کی طرح ہوئی۔ وہ ٹرائی سکل پر چڑھتے تھے اور گھوڑی پر سواری کرتے تھے۔ قابل برہمن انھیں ہندی اور سنسکرت پڑھانے کے لیے رکھے گئے لیکن انھیں زیادہ کامیابی نہیں ملی۔ پھر ان کو سینٹ میری کانونٹ اسکول میں داخل کرایا گیا۔ لیکن چھ مہینوں کے بعد وہاں سے بھی اٹھا لیا گیا اور گھر پر ہی ایک انگریز ٹیوٹر فرڈی ننڈ بروکس نے ان کو پڑھانا شروع کر دیا۔ 20 سال کے اس ٹیوٹر کی نگرانی میں جواہر لال نے ناولوں اور مذہب و سائنس کی کتابیں پڑھنا شروع کیا۔ ان کی پسندیدہ کتابوں میں اسکاٹ، ٹھیکرے، ڈکنس، کپلنگ، لیوس، کیرول اور ایچ جی ویلز کی لکھی ہوئی کتابیں تھیں۔ خاص طور پر لیوس کیرول کی کتاب 'ایلس ان ونڈر لینڈ' کپلنگ کی 'کم' انٹونی ہوپ کی 'پرنسز آف زنڈا' اور جیروم کی کتاب 'مین ان بوٹ' انھیں بہت پسند آئیں۔ پندرہ سال کے ہوئے تو انھیں انگلینڈ پڑھنے کے لیے بھیج دیا گیا۔ انگلینڈ میں پڑھائی سے واپسی پر وہ ہندوستان کو آزاد کرنے کی تحریک میں گاندھی جی کے ساتھی بن گئے۔

1916 میں ان کی شادی دہلی میں ایک کشمیری لڑکی کملا کول سے ہوئی جس کا دعوت نامہ اردو میں شائع کی گیا تھا۔ 19 نومبر 1917 میں ان کے یہاں ایک بچی کا جنم ہوا جس کا نام اندرا پریہ درشنی رکھا گیا۔ بعد میں یہی لڑکی مسز اندرا گاندھی بنیں اور ایک ذہین وزیر اعظم ثابت ہوئیں۔ کملا نہرو نے آزادی کی تحریک میں نہرو جی کا بڑا ساتھ دیا۔ اس دوران وہ اکثر بیمار رہنے لگی تھیں۔ 1936 میں انھیں سوئزر لینڈ کے ایک سینی ٹوریم میں داخل کرایا گیا۔ جواہر لال بیٹی اندرا کو ساتھ کر ان کے ہمراہ گئے تھے۔ شروع میں ان کی حالت کچھ سنبھلی لیکن بعد میں خراب ہوتی گئی اور آخر 28 فروری 1936 میں ان کا انتقال ہو گیا۔ تب نہرو اور اندرا ان کے ساتھ ہی تھے۔

1947 میں جب ہندوستان آزاد ہوا تو وہ وزیر اعظم کے ساتھ ساتھ وزیر خارجہ بھی ہو گئے۔ خارجہ پالیسی کے بارے میں وہ گہرا علم رکھتے تھے۔ خارجہ پالیسی کا مطلب ہے ایک ملک کے تعلقات باقی دنیا سے۔ وہ سچ، اہنسا اور دوسرے گاندھیائی اصولوں کو باقی دنیا کے ملکوں کے آپسی

▲ نہرو بچپن سے جوانی تک

رشتوں کے درمیان میں رکھنا چاہتے تھے۔

ہندوستان جیسے ملک کا وزیر اعظم ہونا ایک سخت اور مشکل کام تھا اور جواہر لال سترہ سال کے لمبے عرصے تک اس ملک کے وزیر اعظم بنے رہے۔ وہ راتوں میں بہت دیر تک کام کرتے رہتے تھے۔ کبھی کبھی تو ان کو کام کرتے کرتے صبح ہو جاتی تھی۔ کئی بار وہ آرام کرنے کے لیے کہیں الگ چلے جاتے تھے لیکن ان کو آرام نہیں مل پاتا تھا۔ وہ لوگوں سے کہا کرتے تھے کہ ان کو سخت محنت کی سزا سنائی گئی ہے۔ عوام کو بھی ملک کی تعمیر کے لیے سخت محنت کرنا چاہیے۔ ''آرام ہے حرام'' ان کا ہی نعرہ تھا۔

جواہر لال اپنے قسم کے انوکھے انسان تھے۔ اپنے بارے میں وہ لیڈر یا وزیر اعظم کی حیثیت سے نہیں سوچتے تھے۔ جھوٹ فریب اور نااہلی سے ان کو غصہ آ جاتا تھا لیکن وہ جلد ہی نارمل ہو جاتے تھے۔ وہ ہمیشہ صبح سویرے اٹھ جاتے تھے اور دن کا کام شروع کرنے سے پہلے کچھ ورزش ضرور کرتے تھے۔ اپنے وعدے وہ ہمیشہ پورے کرتے تھے۔ اگر انھوں نے کسی سے وعدہ کیا کہ وہ فلاں وقت فلاں جگہ موجود ہوں گے تو یقینی طور سے وہ وہاں پہنچ جاتے اور کبھی لیٹ نہیں ہوتے تھے۔ سستی اور لاپروائی سے ان کو نفرت تھی۔

بچوں کو جواہر لال نے بہت کچھ دیا۔ وہ ان سے باتیں کرتے تھے، اپنے ہار پھول بچوں کی طرف اچھال دیتے تھے اور کبھی کبھی ان کے ساتھ کھیلتے بھی تھے۔ ان کی زندگی بہت زیادہ مصروف تھی۔ پھر بھی وہ بچوں کے فنکشن میں جانے کے لیے وقت نکال لیتے تھے۔ بچے ان کو 'چاچا نہرو' کہتے تھے اور 14 نومبر کو اپنے جنم دن کے موقع پر وہ بچوں کی ریلی میں ان سے خوب گھل مل جاتے تھے۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ ملک کا مستقبل بچوں کے ہی ہاتھوں میں ہے۔ دن گزرنے کے ساتھ ساتھ بچوں میں ان کی دل چسپی بڑھتی گئی۔ بہت سے بچوں نے ان سے ملاقات کی یا ان کے ہاتھوں سے انعام حاصل کیا۔ وہ ان کو آج بھی محبت اور احترام سے یاد کرتے ہیں۔ وہ جانوروں اور چڑیوں سے بھی پیار کرتے تھے۔ اکثر پہاڑوں اور جنگلوں میں جایا کرتے تھے تاکہ وہ آدمیوں کی دنیا سے کچھ وقت الگ رہ سکیں۔

جواہر لال اپنے ملک کے لیے بڑی بڑی تمنائیں رکھتے تھے۔ انھیں اپنے لوگوں اور ان کی صلاحیتوں پر ناز تھا۔ انھوں نے اپنی ذات کی کبھی پرواہ نہیں کی۔ انھوں نے ایک مرتبہ کہا تھا: ''میرے دل میں صرف ایک آرزو بچی ہے اور وہ یہ کہ میری زندگی کے جو چند سال باقی بچے ہیں، میں ان میں اپنی بچی ہوئی طاقت اور حوصلے کے ساتھ ملک کی تعمیر کے کام میں پوری طرح جٹ جاؤں۔ میں یہ کام اس وقت تک کرتے رہنا چاہتا ہوں جب تک کہ میں ختم نہ ہو جاؤں اور اس کے بعد کوڑے کے ڈھیر پر پھینک

ہم سب نہرو

نہ دیا جاؤں۔ میں اس بات کی بالکل فکر نہیں کرتا کہ میرے مرنے کے بعد تم یا کوئی اور میرے بارے میں کیا سوچے گا۔ میرے اطمینان کے لیے یہی کافی ہے کہ میں نے اپنی ساری طاقت اور ہمت ہندوستان کے لیے خرچ کر دی۔''

26 مئی 1964 کو وہ آدھی رات تک کام کرتے رہے۔ 27 مئی کی صبح جب جاگے تو ان کو کچھ بے چینی محسوس ہوئی لیکن وہ ایک کتاب پڑھتے رہے۔ ان کی دیکھ بھال کرنے والے نے پوچھا کہ آپ کیسا محسوس کر رہے ہیں۔ انھوں نے جواب دیا وہ کچھ بہتر محسوس نہیں کر رہے ہیں۔ وہ بستر پر لیٹے رہے۔ کمزوری کی وجہ سے اٹھ کر بیٹھ نہیں سکے۔ ڈاکٹر بلائے گئے۔ انھوں نے اپنی ساری کوششیں کر ڈالیں۔ اندرا ان کے پاس موجود تھیں۔ انھوں نے باپ کی زندگی بچانے کے لیے اپنا خون دینے کو کہا لیکن اب اس کی ضرورت نہیں تھی۔

ان کی رحلت کی خبر سن کر پوری قوم سناٹے میں آ گئی۔ انھوں نے اپنی وصیت میں لکھا: ''ہندوستان کے تہذیبی ورثے کو خراج عقیدت

نہرو اور آئنسٹائن

کے طور میں یہ درخواست کرتا ہوں کہ میری مٹھی بھر خاک، الہ آباد میں دریائے گنگا میں بہادی جائے تا کہ وہ اسے لے جا کر اس عظیم سمندر سے ملا دے جو ہندوستان کے ساحل سے ٹکرا رہا ہے۔ میری راکھ کا زیادہ حصہ دوسری طرح سے استعمال کیا جائے۔ میری خواہش ہے کہ اس راکھ کو ہوائی جہاز میں رکھ کر بہت اونچائی پر پہنچا دیا جائے اور وہاں سے اس کو بکھیر دیا جائے تا کہ وہ ان کھیتوں کی مٹی میں مل جائے جہاں

نہرو دوستانہ کرکٹ میچ میں

ہندوستان کے کسان محنت کرتے ہیں۔ اس طرح یہ راکھ ہندوستان کی زمین میں اور دھول میں مل کر ہندوستان کے وجود کا ایک نظر نہ آنے والا حصہ بن جائے گی۔''

زندگی کے آخری برسوں میں انھوں نے اپنے رائٹنگ پیڈ پر مشہور امریکی شاعر رابرٹ فراسٹ کی یہ لائنیں لکھ چھوڑی تھیں:

جنگل بہت پیارے، گھنے اور گہرے ہیں
لیکن مجھ کو اپنا وعدہ پورا کرنا ہے
سونے سے پہلے مجھے میلوں تک آگے جانا ہے
مجھے میلوں تک آگے جانا ہے...

The woods are lovely, dark, and deep
But I have promises to keep,
And miles to go before I sleep,
And miles to go before I sleep

□

انگریزی سے ترجمہ: نامی انصاری،
ماخذ: 'بچوں کے نہرو' از ایم چیلاپتی راؤ، شائع کردہ: قومی اردو کونسل وغیرہ

نظم

کیفی اعظمی

میری آواز سنو...

میری آواز سنو... پیار کا راز سنو...

میں نے اک پھول جو سینے پہ سجا رکھا تھا
اس کے پردے میں تمھیں دل سے لگا رکھا تھا
تھا جدا سب سے مرے عشق کا انداز سنو!

زندگی بھر مجھے نفرت سی رہی اشکوں سے
میرے خوابوں کو تم اشکوں میں ڈبوتے کیوں ہو
جو مری طرح جیا کرتے ہیں کب مرتے ہیں
تھک گیا ہوں مجھے سو لینے دو روتے کیوں ہو
سو کے بھی جاگتے ہی رہتے ہیں جانباز سنو!

میری دنیا میں نہ پورب ہے نہ پچھّم کوئی
سارے انسان سمٹ آئے کھلی بانہوں میں
کل بھٹکتا تھا میں جن راہوں میں تنہا تنہا
قافلے کتنے ملے آج انہی راہوں
اور سب نکلے مرے ہم دم و ہم راز سنو!

نو نہال آتے ہیں ارتھی کو کنارے کرلو
میں جہاں تھا انھیں جانا ہے وہاں سے آگے
آسماں ان کا زمیں ان کی زمانہ ان کا
ہیں کئی ان کے جہاں میرے جہاں سے آگے
انھیں کلیاں نہ کہو ہیں یہ چمن ساز سنو!

کیوں سنواری ہے یہ چندن کی چتا میرے لیے
میں کوئی جسم نہیں ہوں کہ جلاؤ گے مجھے
راکھ کے ساتھ بکھر جاؤں گا میں اس دنیا میں
تم جہاں کھاؤ گے ٹھوکر وہیں پاؤ گے مجھے
ہر قدم پر ہے نئے موڑ کا آغاز سنو!

...میری آواز سنو... پیار کا راز سنو

چاند پر انسان کے قدم

□لیوکاس روٹو
آزاد ترجمہ: عبدالشاہد

ہیرو ایسے لوگوں کو کہا جاتا ہے جو ہوا کا رخ بدل دیتے ہیں اور انہونی کو ہونی میں تبدیل کرتے ہیں۔ پھر چاہے وہ ہمالیہ کی سب سے اونچی چوٹی ماؤنٹ ایوریسٹ کی چڑھائی ہو یا پھر چاند کی سطح پر قدم رکھنے کی آرزو کرنا۔ چاند کی سطح پر قدم رکھنے والے دنیا کے پہلے خلاباز آرم اسٹرانگ نے بھی شاید کبھی یہ نہیں سوچا ہوگا کہ وہ ایک دن ناسا NASA یا National Aeronautics and Space Administration کا بہت ہی خاص خلاباز بن کر چاند کی سطح پر قدم رکھے گا۔

نوجوانی کے دنوں سے ہی اسے ہوا میں تیرنے اور آسمان کے چکر لگانے کا جنون سوار ہوگیا تھا۔ رفتہ رفتہ ناسا کی مدد سے اس نے چاند پر قدم رکھنے کی اپنی پرانی خواہش کو پورا کرنے کی ٹھان لی۔

آرم اسٹرانگ، اس دنیا کا پہلا انسان تھا جس نے چاند پر قدم رکھ کر زمین کے اس سیارے کے بارے تمام پرانے خیالات اور افسانوں کو انسانوں کے ذہن سے کھرچ کر رکھ دیا تھا۔ عام لوگوں کو شاید یہ بات معلوم نہیں ہے کہ وہ کسی فوجی دستہ کا کارکن نہیں بلکہ ایک عام شہری تھا۔

امریکہ کا دل کہے جانے والے علاقہ واپا کونیٹا Wapakoneta (اوہایو، امریکہ) میں 3 اگست 1930 کو ایک عام گھرانے میں اس کی پیدائش ہوئی۔ اس کے والد واپا کونیٹا انتظامیہ میں ملازم تھے۔ ملازمت کی وجہ سے اکثر ان کے تبادلہ مختلف علاقوں میں ہوتے رہتے تھے بچپن سے ہی اسے ہوا میں اڑنے کا شوق تھا اور صرف 6 برس کی عمر میں اس نے پہلی ہوائی سواری کی

اپولو 11، اوپر نیل آرم اسٹرانگ

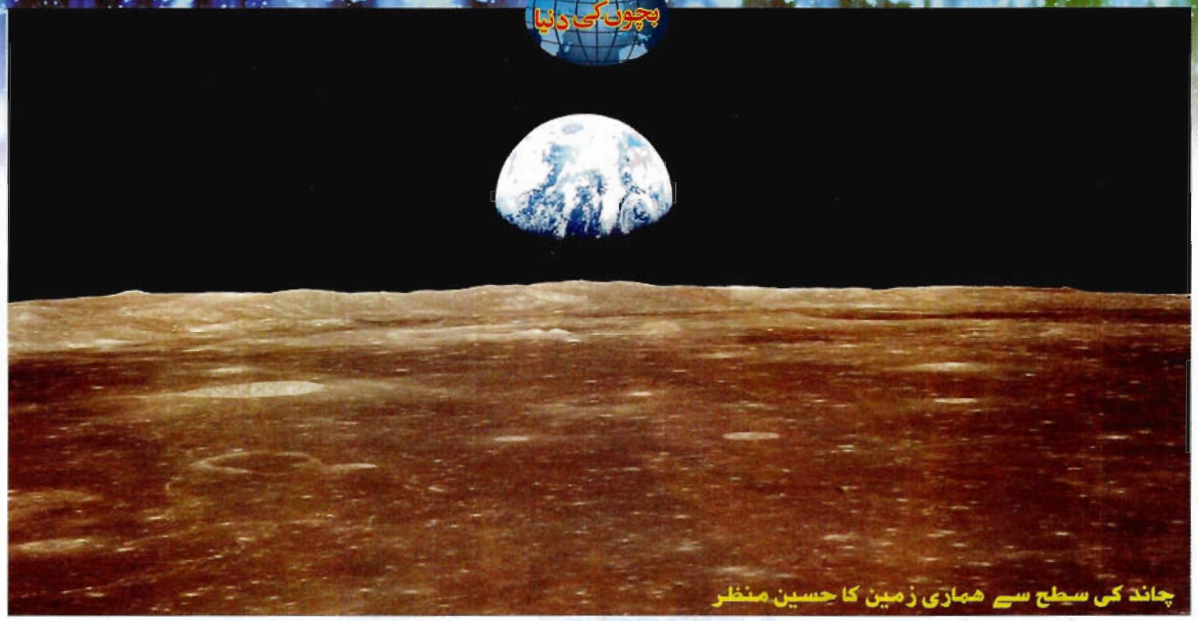

چاند کی سطح سے ہماری زمین کا حسین منظر

تھی۔اسی دن سے ہوائی سفر کی دیوانگی اس کے دل و دماغ پر طاری ہو گئی۔ کچھ روپیہ ادھر ادھر سے بچا کر محض 15 برس کی عمر میں اس نے باضابطہ پائلٹ کا اجازت نامہ License حاصل کرنے کے لئے ہوائی مشق پابندی سے شروع کر دی۔ بعد میں حکومت کے ایک فنڈ کی مدد سے اس نے پردیو Purdue یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ اسی دوران اس نے تین سال فوجی خدمات انجام دیں اور 2 سال تک تعلیم حاصل کرتا رہا۔ اس دوران اسے بحریہ Navy میں طلب کیا گیا اور جیٹ ہوائی جہاز اڑانے کی تربیت حاصل کرنے کے بعد کوریا کے خلاف جنگ میں بھی حصہ لیا۔اس جنگ میں 75 مشن مکمل کرنے کے بعد اور کئی تعریفی ایوارڈ حاصل کرنے کے بعد 1952 میں اس نے نیوی چھوڑ دی۔

1957 میں آرم اسٹرانگ نے سب سے پہلے راکٹ کی پرواز کی ناسا کی لیبارٹری میں کئی دن گزارے اور خلا میں ہونے والی بے شمار تبدیلیوں کا بھی بڑے غور سے جائزہ لیا۔ اسی دوران اس نے کئی چھوٹے موٹے خلائی تجربے بھی کئے جو بعد میں اس کے چاند کے سفر کے لئے بہت مددگار ثابت ہوئے۔ رات دن ناسا کے چکر لگانے کے بعد اور مختلف خلابازوں سے بات چیت کے بعد اس کا دل اب خلا میں قلابازیاں لگانے کے لئے بے چین تھا۔ اس کے لیے اور آگے تعلیم حاصل کر کے اس نے Aeronautical Engineer کی ڈگری حاصل کی جو اس کی زندگی کے لئے میل کا پتھر ثابت ہوئی۔

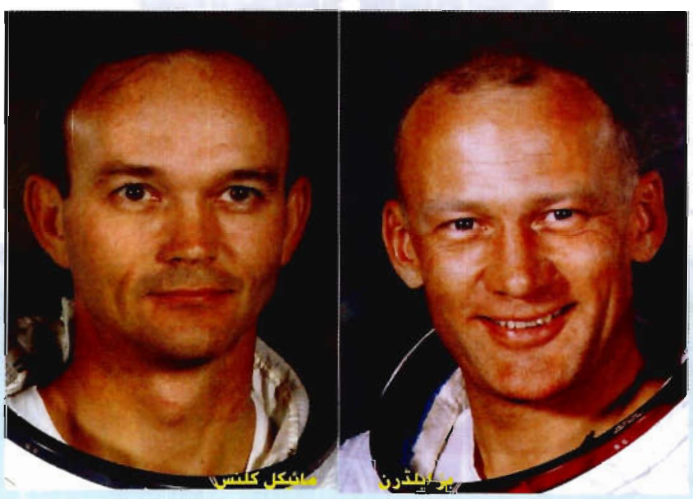

مائیکل کلنس

بز ایلڈرن

انجینئرنگ کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد نیل آرم اسٹرانگ کی قسمت نے ایک کروٹ لی اور ایک سنہری موقع گردش کرتا ہوا اس کی تلاش میں آ پہنچا۔ سوویت یونین کے خلاباز کئی برس سے چاند کا

سفر کرنے کا پروگرام بنا رہے تھے۔ امریکی حکمراں یہ چاہتے تھے کہ کسی بھی طرح سے امریکہ سویت یونین سے اس معاملہ میں سبقت حاصل کرلے اور چاند پر سب سے پہلے پہنچنے کا شرف سوویت روس کو نہیں بلکہ کسی امریکی خلاباز کو حاصل ہو۔ اس کے لئے امریکی حکومت کوشش میں لگی ہوئی تھی۔ اس بارے میں اخبارات میں اشتہارات دیئے گئے۔ اپنے خواب کو پورا کرنے کی خاطر آرم اسٹرانگ نے قسمت آزمانے کا فیصلہ کیا اور ایک عرضی ناسا کو پیش کردی جو جلد ہی منظور ہوگئی۔ ناسا کی جانب سے پہلی مرتبہ دو خلاباز جیمنی۔8 کے ذریعہ سفر شروع کرنے والے تھے۔ اس مشن کو پورا کرنے کے لئے انہوں نے رات دن خوب محنت کی اور لگاتار ذہنی و جسمانی مشقت و تربیت کرکے ایک کامیاب خلاباز کی حیثیت سے اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوالیا۔ ان کے ساتھ دوسرے خلاباز ڈیوڈ اسکاٹ بھی تھے لیکن کچھ تکنیکی خرابیوں کی وجہ سے جیمینی۔8 کا یہ خلائی سفر منسوخ کرنا پڑا۔

چاند پر خلاباز اور تجربوں کا سامان

مگر آرم اسٹرانگ دھن کا پکا اور ارادے کا دھنی تھا۔ اس نے محنت جاری رکھی اور چاند کی سطح پر قدم رکھنے کے ارادہ کو اور مضبوط کرلیا۔ اس مرتبہ امریکی خلائی جہاز اپولو۔11 خلا میں پہنچنے کے لئے تیار تھا۔ ناسا نے بھی اپولو۔11 کے لئے پوری طاقت لگا دی۔ آرم اسٹرانگ کے ساتھ دو اور خلاباز بزایلڈرن Buzz Aldrin اور مائیکل کالنس Michael Collins بھی شریکِ سفر تھے۔ آرم اسٹرانگ کو کمانڈرانِ چیف بنایا گیا۔ 17 جولائی 1969 کو اپولو۔11 ہماری زمین سے چاند کے سفر پر روانہ ہوا اور 20 جولائی 1969 وہ تاریخی دن تھا جب آرم اسٹرانگ نے خلائی طیارہ کی سیڑھی سے اتر کر چاند پر پہلا قدم رکھا۔ ہندوستان تب آدھی رات کا وقت تھا اور آسمان میں چاند پورا نکلا ہوا تھا۔ چاند کی سطح پر اپنا بایاں پیر رکھنے کے بعد نیل آرم اسٹرانگ نے جو تاریخی جملہ انگریزی میں کہا اس کا مفہوم تھا: ''یہ ایک آدمی کا چھوٹا سا قدم لیکن انسان کی زبردست چھلانگ ہے!''

"That's one step for a man, but one giant leap for mankind."

دنیا بھر کے کروڑوں لوگوں نے اپنے ریڈیو سیٹ پر یہ جملہ سنا اور ٹیلی ویژن پر اس منظر کو براہ راست دیکھا۔

آرم اسٹرانگ نے بتایا کہ جہاں ان کا اپولو۔11 اترا تھا وہاں چاند کی سطح کوئلے کے چورے کی طرح ہے۔ وہاں قریب ایک فٹ گہرا گڈھا ہوگیا تھا۔ اسی وقت انہوں نے چاند کی سطح پر امریکی قومی پرچم نصب کیا اور امریکی صدر رچرڈ نکسن کے دستخط والی ایک پٹی بھی لگادی جس پر لکھا تھا ''یہاں زمین کے انسان نے پہلے بار 20 جولائی 1969 کو قدم رکھا تھا اور یہ اس نے تمام انسانوں کے لئے امن کی خاطر کیا!''

اس موقع پر دوسرے خلاباز بزایلڈرن اس کے ساتھ تھے جب کہ مائیکل کالنس اس خلائی جہاز میں چاند کے گرد چکر لگا رہے تھے جس کے ذریعہ نیل آرم اسٹرانگ کی چاند گاڑی کو چاند کی زمین پر اتارا گیا تھا۔

1957 میں دنیا کا پہلا مصنوعی سیارہ اسپتنک زمینی مدار میں بھیج کر دنیا میں خلائی سفر کا آغاز کرنے والا سوویت یونین اگرچہ چاند پر انسان کو اتارنے کی دوڑ میں پچھڑ گیا تھا لیکن دنیا اس وقت حیران رہ گئی جب یہ معلوم ہوا کہ روس کا ایک خلائی جہاز جس میں کوئی انسان سوار نہیں تھا امریکیوں کے چاند پر پہنچنے سے پہلے ہی چاند کے چکّر لگا رہا تھا۔ ایسے ہی ایک جہاز سے بعد میں روسیوں نے چاند پر نہ صرف اپنی چاند گاڑی اتاری بلکہ وہاں زمین کھدوا کر چاند کی مٹی بھی منگالی۔ کسی انسان کو چاند پر بھیجے بغیر! □

♦ عبدالشاہد، اردو جونیر کالج، پوسا، ایوت محل مہاراشٹر۔445001

□ نعمان قیصر

خوشیوں کا تہوار دیوالی

'روشنیوں کا تہوار' دیوالی ہندوستان کا بے حد پرانا اور ہندوؤں کا سب سے بڑا تہوار ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ اسے صرف ہندو مناتے ہیں۔ جین اور سکھ بھی اس دن کو اپنا مذہبی تعلق ہونے کی وجہ سے تہوار کے طور پر مناتے ہیں۔ مسلمانوں کا اگرچہ مذہبی طور پر اس تہوار سے کچھ لینا دینا نہیں ہے لیکن ہندوستانی روایات اور تہذیب کا حصہ بن جانے کی وجہ سے وہ بھی اپنے ہم وطنوں کی خوشی میں شریک ہوتے ہیں۔ دیوالی کے معنی ہیں دیوں کی قطار۔ یہ دسہرے یا وجے دشمی کے بعد اٹھارہویں دن اماوس کی رات میں منائی جاتی ہے۔ یعنی یہ ایک طرح سے اندھیرے کو دیوں کی روشنی سے ہرانے کی رات ہوتی ہے۔ وجے دشمی پر دس سروں والے راون کا خاتمہ کرنے کے بعد اجودھیا کے راجہ رام چندر سیتا جی کو لے اپنی راجدھانی کو لوٹے تھے تو وہ اماوس کی اندھیری رات تھی جسے چراغوں کی روشنی سے جگمگا دیا گیا تھا۔ جینیوں کے عقیدے کے مطابق اس روز 527 سال قبل مسیح (حضرت عیسیٰ کی ولادت سے پہلے) ان کے مذہب کے بانی مہاویر جی نے نروان حاصل کیا تھا، جسے موکش یا نجات بھی کہتے ہیں۔ آریہ سماجی ہندوؤں کے لیے یہ سوامی دیانند سرسوتی کی وفات کا دن ہے اور اسے 'شاردیہ نوشس یشٹھی' کے طور پر مناتے ہیں۔ سکھوں کا دیوالی سے یہ تعلق ہے کہ اسی دن امرتسر میں 1577 میں دربار صاحب کا سنگ بنیاد رکھا گیا تھا اور 1619 میں دیوالی کے ہی دن سکھوں کے چھٹے گرو ہرگوبند سنگھ جی کو جیل سے رہا ہوئے تھے۔ ہندوستان کے علاوہ دیوالی کے روز نیپال، سری لنکا، میان مار (برما) ماریشس، گیانا، سوری نام، گیانا، ٹرینیڈاڈ اینڈ ٹوبیگو، ملیشیا، سنگاپور اور فجی میں بھی عام چھٹی ہوتی ہے، کیونکہ ان ملکوں میں ہندو اچھی خاصی تعداد میں رہتے ہیں۔

اگرچہ زیادہ مشہور بات یہ ہے کہ راجہ رام چندر کی اجودھیا واپسی کی خوشی میں یہ تہوار منایا جاتا ہے لیکن ایک قصہ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ سری کرشن جی مہاراج کے دور میں نرک کے ایک اسُر نے لوگوں پر بڑا ظلم ڈھا رکھا تھا جسے سری کرشن کی رانی ستیہ بھاما نے بڑی حکمت سے مار دیا تھا، اس کے ظلم سے نجات پانے کی خوشی میں ہندو قوم دیوالی کا تہوار مناتی ہے۔ کہتے ہیں کہ پانڈو 12 سال کے بن باس کے بعد اسی روز واپس آئے تھے۔ ہندو اس تہوار کو دولت کی دیوی لکشمی سے بھی منسوب کرتے ہیں اور ان کی پوجا کرکے اپنی خوش حالی کی دعا مانگتے ہیں۔ بنگال کے ہندو اس روز کالی ماتا کی پوجا کرتے ہیں جنھوں نے ان کے عقیدے کے مطابق برائی کی تمام طاقتوں پر جیت حاصل کی تھی۔ جنوبی ہندوستان کے لوگ دیوالی کے موقع پر وشنو جی کی پوجا کرتے ہیں، ان کا ماننا ہے کہ اس دن وشنو جی نے بدی پر غلبہ حاصل کیا تھا۔

دیوالی گھروں کی صفائی اور چراغاں کا تہوار ہے۔ کئی ہفتے پہلے ہی دیوالی کی

دھلی میں دیوالی کی رات

تیاریاں شروع ہو جاتی ہیں۔لوگ اپنے گھروں، دکانوں وغیرہ کی صفائی کر دیتے ہیں اور انہیں سجاتے ہیں۔کل ملا کر یہ پانچ روز کا تہوار ہے جو دھن تیرس کے دن شروع اور بھائی دوج کو ختم ہوتا ہے۔ دھن تیرس ہندو کلینڈر کے ساتویں مہینے اشون کے گھٹتے چاند والے پندرہواڑے (کرشنا پکش) حصے میں چاند کی 13 تاریخ کو ہوتی ہے۔ اور بھائی دوج اس کلینڈر کے آٹھویں مہینے کارتک کے بڑھتے چاند والے پندرہواڑے (شُکل پکش) میں چاند کی دوسری تاریخ کو پڑتی ہے۔

دیوالی ہندوؤں کا تہوار ضرور ہے لیکن دوسرے مذہب کے لوگ بھی دیوالی کے موقع پر خوشی کا اظہار کرے ہیں اور ایک دوسرے کو اس کی مبارکباد دیتے ہیں۔ہندوستانی مسلمان بادشاہ بھی دیوالی کا تہوار پورے جوش وخروش کے ساتھ مناتے اور شاہی محل کو روشنی سے سجاتے تھے۔ اکبراعظم کے دور حکومت میں دولت خانے کے سامنے 40 گز اونچے بانس پر ایک بڑا آکاش دیپ دیوالی کے دن لٹکایا جاتا تھا۔بادشاہ جہانگیر بھی دیوالی دھوم دھام سے مناتا تھا۔مغل خاندان کے آخری بادشاہ بہادر شاہ ظفر دیوالی کو تہوار کے طور پر مناتے تھے اور اس میں بھر پور حصہ لیتے تھے۔شاہ عالم ثانی کے وقت میں پورے شاہی محل کو چراغوں سے سجایا جاتا تھا اور لال قلعہ میں خوشیاں منائی جاتی تھیں جن میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل ہوتے تھے۔

دیوالی کے دن ہندوستان میں مختلف جگہوں پر میلے لگتے ہیں۔ دیوالی ایک دن کا تہوار نہیں بلکہ تہواروں کا مجموعہ ہے۔ دسہرے کے بعد ہی دیوالی کی تیاریاں شروع ہو جاتی ہیں۔دیوالی سے دو دن پہلے دھن تیرس پر بازاروں میں خوب رونق ہوتی ہے۔ برتنوں کی دکانوں سے خاص طور پر نئے برتن خریدتے ہیں جسے شبھ مانا جاتا ہے۔ اس دن تلسی یا گھر کے دروازے پر ایک چراغ جلایا جاتا ہے اور بازاروں میں کھلونے، بتاشے، مٹھائیاں، لکشمی، گنیش وغیرہ کی مورتیاں فروخت ہونے لگتی ہیں۔ دیوالی کی شام لکشمی اور گنیش جی کی پوجا کی جاتی ہے۔پوجا کے بعد لوگ اپنے اپنے گھروں کے باہر چراغ اور موم بتیاں جلا کر رکھتے ہیں۔ چاروں طرف چمکیلے دیپک بہت ہی خوبصورت دکھائی دیتے ہیں۔ رنگ برنگے بجلی کے بلبوں اور قمقموں سے بازار اور گلیاں روشن ہوجاتے ہیں۔ دیر رات تک کارتک کی اندھیری رات پورے چاند کے بغیر ہی جگمگا اٹھتی ہے۔اگلے دن بھائی دوج کا تہوار ہوتا ہے۔

دیوالی روشنی کے علاوہ مٹھائیوں اور خوب صورت رنگولیوں کا بھی تہوار ہے۔ لوگ ایک دوسرے کو مٹھائی اور میووں کا تحفہ دیتے ہیں۔گھروں میں دروازوں پر لکشمی جی کے سواگت کے لیے طرح طرح کی سندر رنگولیاں بنائی جاتی ہیں۔آتش بازی کے بغیر دیوالی کا ذکر ادھورا ہے۔ بچے خوب پھلجھڑیاں جلاتے اور پٹاخے چھوڑتے ہیں۔ شہروں میں آتش بازی کے دھماکوں سے رات بھر کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔اس کا قدرتی ماحول پر برا اثر پڑنے لگا ہے اور آگ لگنے کے حادثے بھی بڑھ گئے ہیں۔تنظیموں نے آتش بازی کے خلاف لوگوں کو بیدار کرنے کی مہم شروع کر دی ہے جس کا بچوں پر بھی اچھا اثر ہوا ہے اور کئی بڑے شہروں میں آتش بازی کا زور گھٹنے لگا ہے۔ □

♦ نعمان قیصری 22 فرسٹ فلور نیوٹھوکر 8 شاہین باغ ابوالفضل اینکلیو نئی دہلی۔25

□ جاوید اکرم

جگنو بھائی

جگنو بھائی جگنو بھائی
کیسی تم نے جوت جگائی
دن میں کہاں چھپ جاتے ہو
بس راتوں کو آتے ہو
نیچے آؤ، نیچے آؤ
تم بھی ہم میں گھل مل جاؤ
ننھے منے بچے ہیں
ہم سب من کے سچے ہیں
سب ہم جولی کھیلیں گے
آنکھ مچولی کھیلیں گے
تم بھی ہمارے دوست بنو
کھیلو، کودو ساتھ رہو
گلیوں گلیوں گھومیں گے
مستی میں ہم جھومیں گے
تم بھی جگمگ کرتے ہو
دل خوشیوں سے بھرتے ہو
ہم بھی آنکھ کے تارے ہیں
سب کے راج دلارے ہیں
تم بھی دل کے سچے ہو
ہم جیسے ہی بچے ہو

◆ جاوید اکرم، کیندریہ ودیالیہ، آئی آئی ایم پربندھ نگر لکھنؤ 226013

بڑھیا اور چڑیا کی کہانی

□ محمد طلحہ صدیقی

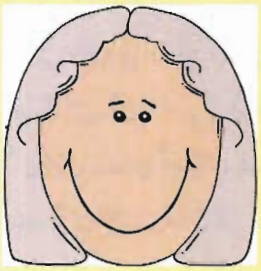

آؤ بچو گیت سنائیں
گیت سنائیں اور ہنسائیں
اک بڑھیا نے چڑیا پالی
ننھی منی بھولی بھالی
بڑھیا بیٹھی کھیر پکاتی
چڑیا میٹھے گیت سناتی
اک دن بڑھیا بھوکی آئی
جلدی جلدی کھیر پکائی
منہ دھو کر وہ کھانے بیٹھی
چڑیا گیت سنانے بیٹھی
بڑھیا نے سب کچھ کھا ڈالا
چڑیا کو بھوکا ہی ٹالا
چڑیا جب پنجرے میں آئی
بھوک سے اس کو نیند نہ آئی
چوں چوں چوں چوں کر کے روئی
ساری رات اسی میں کھوئی
صبح ہوئی اور مرغا بولا
تب بڑھیا نے پنجرا کھولا
پیار سے جب اس کو چمکارا
چڑیا نے چونچوں سے مارا
بڑھیا بھاگی گھر میں آئی
مٹھی بھر کر دانا لائی
جب بڑھیا نے دانا کھلایا
تب چڑیا نے گیت سنایا

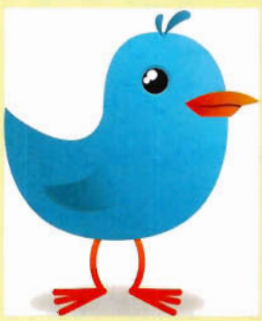

◆ محمد طلحہ صدیقی N-122، ابوالفضل اینکلو، جامعہ نگر، نئی دہلی 110025

□ جگن ناتھ آزاد

فلسفی شاعر ڈاکٹر اقبال

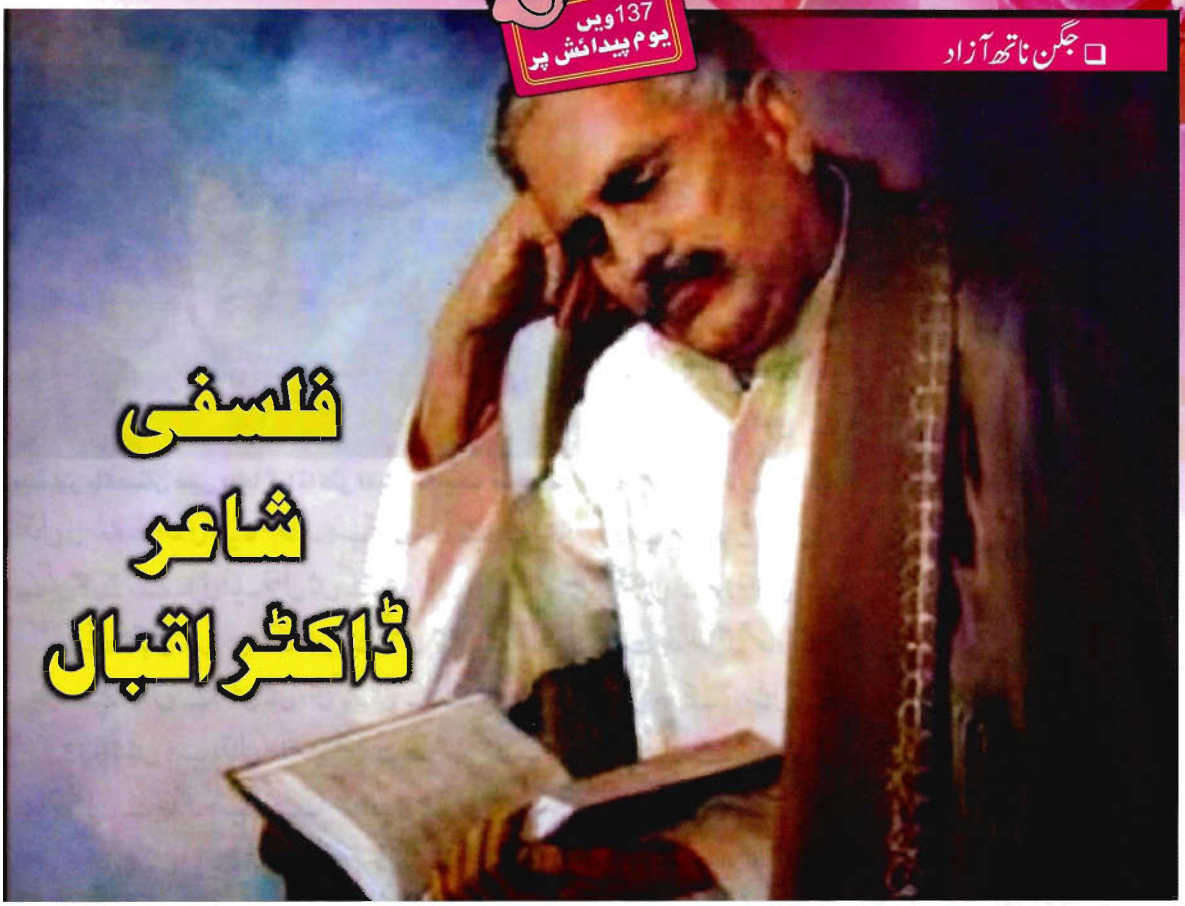

پیارے بچو! اگر کوئی تم سے پوچھے کہ اردو کے دو بڑے شاعر کون ہیں تو تم غالباً جواب میں کہو گے ''غالب اور اقبال۔'' اور تمھارا جواب یقیناً صحیح ہوگا۔ غالب اور اقبال اردو کے دو ایسے نام ور شاعر ہیں جن کی بدولت اردو شاعری کا نام دنیا کے گوشے گوشے میں پہنچ گیا ہے۔ دراصل بڑا شاعر یا بڑا فن کار کسی ایک ہی ملک کا ہو کر نہیں رہ جاتا وہ ساری دنیا کی محبوب شخصیت بن جاتا ہے۔ جیسے شیکسپیئر، ملٹن، پشکن، حافظ، سعدی، فردوسی، کالی دس، گوئٹے، دانتے وغیرہ!

اقبال بہت پڑھے لکھے شاعر تھے۔ اردو فارسی اور انگریزی کے علاوہ عربی اور جرمن میں بھی مہارت رکھتے تھے، ہندی اور سنسکرت سے بھی آشنا تھے اور مختلف علوم اور فنون کی کتابیں ہر وقت ان کے مطالعے میں رہتی تھیں۔ لیکن اتنے بڑے عالم اور فلسفی ہونے کے باوجود وہ بہت ہی شگفتہ مزاج انسان تھے۔ بچوں کے مستقبل سے اقبال کو بڑی دل چسپی تھی۔ بچوں کی ذہنی تربیت کے لیے انھوں نے ایسے مضامین لکھے اور ایسی دل کش نظمیں کہیں جنھیں بچے شوق پڑھتے ہیں۔

اقبال کی والدہ

اقبال 9 نومبر 1877 کو سیال کوٹ میں پیدا ہوئے۔ یہ پاکستان کی سرحد پر جو ریاست جموں کشمیر سے ملتی ہے ایک بارونق شہر ہے۔ ان کے والد شیخ نور محمد تھے جو بہت زیادہ پڑھے لکھے یا دولت مند تو نہیں لیکن علم دوست انسان تھے۔ اس زمانے میں مولانا سید میر حسن کو سیال کوٹ کا سب سے بڑا عالم سمجھا جاتا تھا۔ والد نے تربیت و تعلیم کے لیے اقبال کو سید میر حسن کے سپرد کر دیا۔ استاد شاگرد کا یہ تعلق ساری عمر قائم رہا۔

ڈاکٹر اقبال کی کم یاب تصویریں

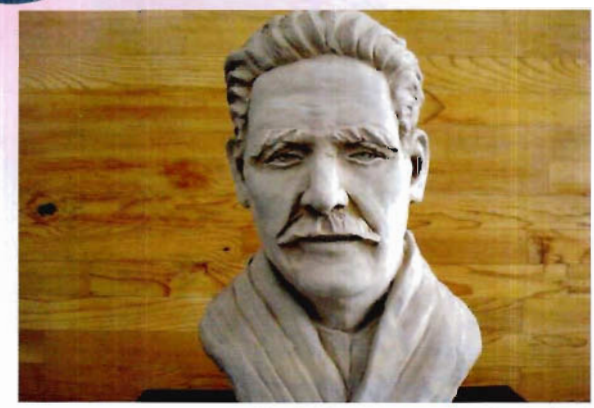

پیشاور پاکستان میں بنایا گیا ڈاکٹر اقبال کا ایک مجسمہ

اقبال کی سعادت مندی کا یہ عالم تھا کہ جب تک زندہ رہے اپنے استاد کے گن گاتے رہے۔ اپنی ایک غزل میں کہتے ہیں:

مجھے اقبال اس سید کے گھر سے فیض پہنچا ہے
پلے جو اس کے دامن میں وہی کچھ بن کے نکلے ہیں

1933 میں جب اقبال کو انگریز حکومت نے سر کا خطاب دینا چاہا تو انھوں نے کہا کہ جب تکمیر ے استاد مولوی میر حسن کو بھی شمس العلما کا خطاب نہیں دیا جاتا تب تک میں سر کا خطاب قبول نہیں کروں گا۔ پنجاب کے گورنر نے کہا سید میر حسن نے کوئی کتاب تصنیف نہیں کی اس لیے انھیں شمس العلما کا خطاب دینا دشوار ہے۔ اقبال نے فوراً کہا ''ان کی زندہ کتاب میں ہوں ۔ اس سے بڑھ کر آپ کون سی کتاب چاہتے ہیں؟'' گورنر سر ایڈورڈ میکلیگن اس جواب سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انھوں نے فوراً اقبال کا مطالبہ حکومت برطانیہ تک پہنچا دیا جسے منظور کرلیا گیا۔ چنانچہ جب اقبال کو سر کا خطاب ملا تو حکومت نے مولوی میر حسن کو بھی شمس العلما کا خطاب دیا۔

موسم سرما میں کھینچی گئی تصویر

اقبال کی شاعری کی ابتدا ہو چکی تھی اور وہ سیال کوٹ کے ایک چھوٹے سے مشاعرے میں کبھی کبھار اپنا کلام سنانے جایا کرتے تھے۔ انھوں نے چند غزلیں اصلاح کے لیے نواب مرزا داغ دہلوی کو بھیجیں ۔ مرزا داغ نے بہت جلد لکھا کہ تمھارا کلام بڑی حد تک اصلاح سے بے نیاز ہے یعنی اس پر اصلاح کی ضرورت نہیں ہے۔ بس مطالعہ اور مشق سخن جاری رکھو۔ داغ کی زندگی ہی میں اقبال کو پورے ملک میں شہرت مل گئی اور استاد شاگرد پر اور شاگرد استاد پر ہمیشہ فخر کرتا رہا۔

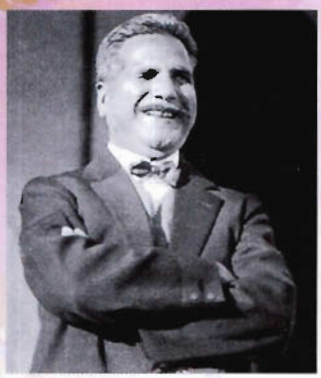

خوش گوار موڈ میں

اقبال اور ان کے فرزند جاوید اقبال

اقبال کا علم اور کتابوں کے ساتھ وہی تعلق تھا جو ایک پیاسے انسان کا ٹھنڈے میٹھے پانی کے چشمے کے ساتھ ہوتا ہے۔ ان کی علم کی پیاس بجھتی ہی نہیں تھی۔ یہ پیاس انھیں یوروپ کی یونیورسٹیوں تک

اسپین میں

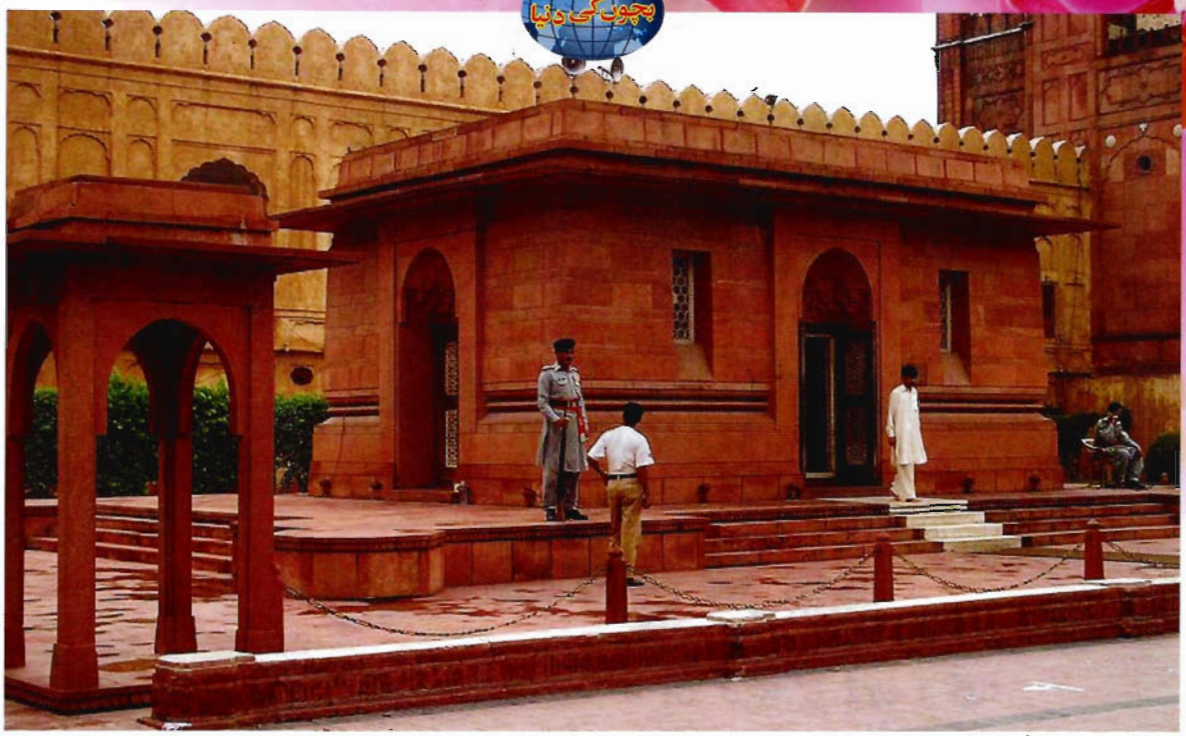

لاہور کی بادشاہی مسجد میں اقبال کا مقبرہ

پہنچنے کے لیے اکساتی رہی۔ آخر ایک دن ان کی یہ خواہش پوری ہوئی اور وہ ستمبر 1905 میں ہندوستان سے یوروپ روانہ ہو گئے۔ لاہور سے چل کر وہ پہلے دہلی رکے اور حضرت محبوب الٰہی خواجہ نظام الدین اولیا ؒ کی درگاہ پر پہنچ کر دعا مانگی۔ دہلی سے چل کر بمبئی اور بمبئی سے سمندری جہاز کے ذریعے انگلستان پہنچے۔ وہاں کیمبرج میں داخلہ لیا۔ تین سال بعد اقبال ایم اے پی ایچ ڈی بیرسٹر ایٹ لا ہو کر وطن واپس آئے۔ ان کی شاعری نے اور فلسفے پر لکھی ہوئی کتابوں نے ہندوستان میں ہی نہیں ہندوستان کے باہر بھی ان کی دھوم مچادی۔

1936 کے آخر میں اقبال کو دمے کے دورے شروع ہو گئے تھے۔ اس کے بعد وہ اکثر بیمار رہنے لگے۔ 20 اپریل 1938 کو بلغم میں خون آیا۔ 21 اپریل کی صبح انھوں نے آخری سانس لی۔

اقبال کی موت پر ہندوستان اور ہندوستان سے باہر کے بڑے لوگوں نے جن الفاظ میں اپنے دلی رنج کا اظہار کیا اور اخباروں وغیرہ میں جو کچھ لکھا اسے جمع کیا جائے تو کئی دفتر مرتب ہو سکتے ہیں۔ جواہر لال نہرو اس زمانے میں کانگریس کے صدر تھے، انھوں نے لکھا:

''میں نے انتہائی درد والم کے ساتھ سر محمد اقبال کے انتقال کی خبر سنی ہے۔ ابھی تھوڑی ہی مدت کی بات ہے کہ جب وہ بیمار تھے تو میں نے ان کے ساتھ لمبی بات چیت کی تھی۔ ان کی ذہانت اور ہندوستان کی آزادی کے ساتھ ان کی محبت سے میں بہت متاثر ہوا تھا۔ ان کی موت سے ہندوستان کے افق پر ایک روشن اور تابناک ستارہ غروب ہو گیا ہے۔ لیکن ان کی عظیم الشان شاعری ان کی یاد کو آنے والی نسلوں کے دلوں میں زندہ رکھے گی اور انھیں متاثر کرتی رہے گی۔''

بچو، 1904 میں اقبال کے قلم سے ایک ایسی نظم نکلی جو مدتوں تک ہندوستان کے قومی ترانے کے طور پر استعمال ہوتی رہی اور آج بھی جن گن من اور بندے ماترم کے بعد وہی نظم ہے جو ہندوستان کے اکثر اسکولوں اور ادبی جلسوں میں قومی ترانے کے طور پر گائی جاتی ہے۔ یہ نظم ہے 'سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا' یہ نظم تم نے اپنی درسی کتابوں میں پڑھی بھی ہوگی اور اپنے اسکول میں گائی بھی ہوگی اور ممکن ہے تمھیں زبانی بھی یاد ہو!□

ماخذ: 'اقبال کی کہانی' از پروفیسر جگن ناتھ آزاد، شائع کردہ: قومی اردو کونسل

ڈاکٹر اقبال

پرندے کی فریاد

آتا ہے یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانہ وہ باغ کی بہاریں چڑیوں کا چہچہانا
آزادیاں کہاں اب وہ اپنے گھونسلے کی اپنی خوشی سے آنا اپنی خوشی سے جانا
لگتی ہے چوٹ دل پر آتا ہے یاد جس دم شبنم کے آنسوؤں پر کلیوں کا مسکرانا
وہ پیاری پیاری صورت وہ کامنی سی مورت آباد جس کے دم سے تھا میرا آشیانا

آتی نہیں صدائیں اس کی مرے قفس میں
ہوتی مری رہائی اے کاش میرے بس میں

کیا بدنصیب ہوں میں گھر کو ترس رہا ہوں ساتھی تو ہیں وطن میں، میں قید میں پڑا ہوں
آئی بہار کلیاں پھولوں کی ہنس رہی ہیں میں اس اندھیرے گھر میں قسمت کو رو رہا ہوں

اس قید کا الٰہی دکھڑا کسے سناؤں
ڈر ہے یہیں قفس میں میں غم سے مر نہ جاؤں

جب سے چمن چھٹا ہے یہ حال ہو گیا ہے دل غم کو کھا رہا ہے غم دل کو کھا رہا ہے
گانا اسے سمجھ کر خوش ہوں نہ سننے والے دکھتے ہوئے دلوں کی فریاد یہ صدا ہے

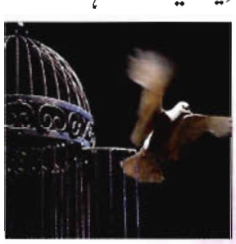

آزاد مجھ کو کر دے او قید کرنے والے
میں بے زباں ہوں قیدی تو چھوڑ کر دعا لے!

عظیم اقبال

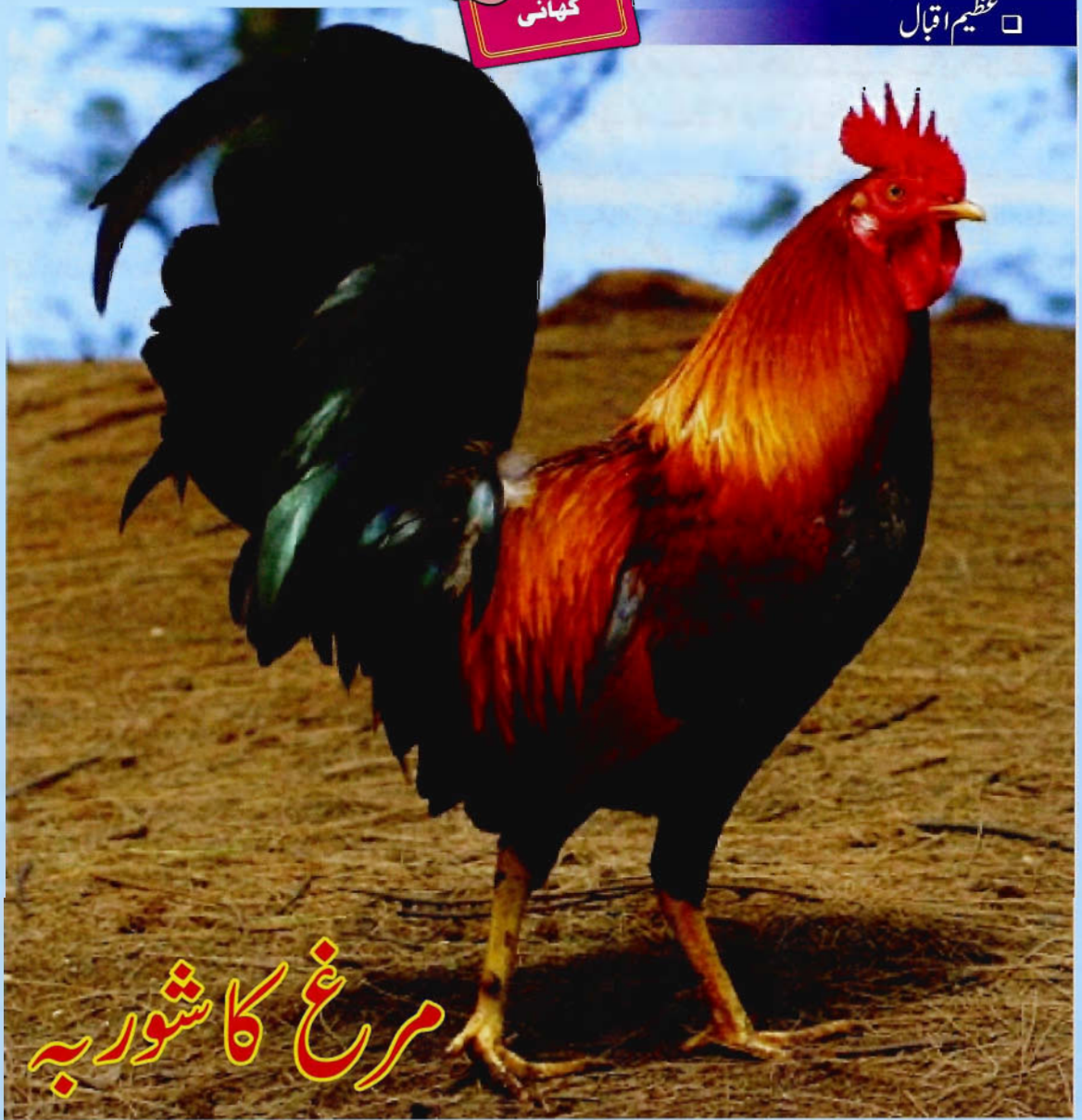

مرغ کا شوربہ

اس سرزمین پر کسی زمانے میں ایک شخص تھا، جس کا نام عمر تھا۔ وہ دردمند اور سخی تھا۔ کسی پر بُرا وقت پڑتا، تو وہ اس کی مدد سے گریز نہ کرتا۔ جان و مال کے ساتھ وہ حاضر ہو جاتا۔ بدلے میں اپنی احسان مندی کا اظہار لوگ مختلف طریقوں سے کرتے۔

ایک دن، ایک کسان نے جس کی عمر نے کبھی مدد کی تھی، عمر کو تحفتاً ایک مرغ پیش کیا۔ عمر تحفہ قبول کرنے کے حق میں نہ تھا۔ لیکن مقابل کے اصرار کے آگے اس کی نہ چلی۔ مرغ موٹا تازہ اور جاندار تھا۔ وہ حیرت سے منہ کھولے، ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ عمر کے گھر آتے ہی اس نے بانگ دینا شروع کر دیا۔ ''ککڑوں کوں، ککڑوں کوں!''

عمر کے بچوں نے پہلے کبھی مرغ نہیں پالا تھا۔ سب کے سب کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

عمر کے گھر چند روز کے قیام میں مرغ نے گھر کا کونا کونا دیکھ لیا۔

اِدھر سے پھدک کر اُدھر چلے جانا، اور پھر اُدھر سے پھدک کر اِدھر چلے آنا۔ آنگن سے پَر پھڑ پھڑا کر وہ چھت تک پہنچ جاتا۔ چھت سے پڑوسی کی راہ پر تک جانا کٹھن نہیں تھا۔ آس پاس کے لوگ باگ اس تاک میں تھے مرغ گھر سے باہر نکلے۔ مرغ جس آسانی سے گھر میں وارد ہوا تھا اس آسانی سے گھر کے باہر جانے پر بھی تلا ہوا تھا۔ ذرا سا پَر پھڑ پھڑانے اور تھوڑا سا پھدکنے سے اس کی مراد پوری ہوسکتی تھی۔ لہٰذا عمر کی بیوی نے مرغ پکانے کی ٹھان لی۔ عمر نے 'بسم اللہ' کے ساتھ مرغ کو ذبح کرنے کے لئے دبوچا۔ ذبح ہوتے ہوئے مرغ نے بڑا دم خم دکھایا۔ بیوی نے سب گھر والوں کے لئے شوربہ دار مرغ تیار کیا۔ مرغ پکانے میں اسے خاص مہارت حاصل تھی۔ کھانے والے انگلیاں چاٹتے رہ جاتے تھے۔

اگلے دن دو لوگ عمر کے گھر آئے۔ عمر کے لئے دونوں اجنبی تھے۔ ان میں سے ایک کی گھنی مونچھیں تھیں اور دوسرے کی لمبی داڑھی تھی۔ دونوں کے ہاتھوں میں اپنی اپنی لاٹھیاں تھیں۔ یہ رات کے کھانے کا وقت تھا۔ دونوں نے اپنا تعارف کرایا۔

''ہم اس شخص کے پڑوسی ہیں، جس نے آپ کو مرغ پیش کیا تھا۔'' یہ کہتے ہوئے دونوں گھر کے مالک کی اجازت لیے بغیر بیٹھ گئے۔ عمر کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ یہ تو وہی بات ہوگئی، مان نہ مان، ہم تیرے مہمان۔ پھر بھی اخلاقاً عمر نے ان کے سامنے تھوڑا شوربے دار مرغ پیش کر دیا۔ عمر کی گھر والی کا بچایا ہوا مرغ مہمانوں کے کام آیا۔

کھانے سے فارغ ہوکر میزبان کا شکریہ ادا کیے بنا ہی دونوں اجنبی اپنے ڈنڈے کھٹکھٹاتے ہوئے وہاں سے چل پڑے۔ جاتے ہوئے وہ عمر سے نہ تو ہم کلام ہوئے نہ کوئی گلے ملا اور نہ کسی نے مصافحہ کیا۔

ایک ہفتہ گذرنے پر عمر کے گھر چار دوسرے لوگ رات کے کھانے پر آ گئے۔ عمر اور اس کے گھر والوں کے لیے یہ سب بھی اجنبی تھے۔ ان میں ایک چھوٹے قد کا تھا جس کی آنکھیں باہر کی جانب ابلی پڑیں تھیں۔ دوسرے نے بڑی سی پگڑی باندھ رکھی تھی۔ تیسرے کے سر پر ٹوپ تھا اور چوتھے کی توند نکلی ہوئی تھی۔ سب نے سُر میں سُر ملا کر کہا۔

''جس شخص نے آپ کو مرغ پیش کیا تھا، ہم لوگ اس کے پڑوسی کے پڑوسی ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ سب بے تکلفی سے وہیں بیٹھ گئے۔ انھیں امید تھی کہ اب ان کی بھی خاطر تواضع ہوگی۔ بڑی چاہت اور محبت سے سب عمر کی جانب دیکھ رہے تھے۔

''ٹھیک ہے۔ میں آپ کے لیے شوربے دار مرغ لاتا ہوں۔''

عمر باورچی خانے میں گیا اور تھوڑی دیر بعد ایک بڑے برتن میں کھولتا ہوا پانی لے آیا۔ اس نے برتن مہمانوں کے سامنے رکھ دیا۔

''لیجیے۔ اپنی مدد آپ کریں۔'' عمر نے چاروں سے کہا۔

اجنبیوں نے کھولتے ہوئے پانی کو دیکھا، پھر ایک دوسرے سے آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارے ہوئے۔

''یہ کیسا شوربے دار مرغ ہے؟'' انہوں نے عمر سے سوال کیا۔

عمر کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا۔ اپنے اونچے ہوتے ہوئے لہجے پر قابو پانا اس کے لئے مشکل ہو رہا تھا۔

''اے مرغ کے مالک کے پڑوسی کے پڑوسیو!'' عمر نے کہا۔ ''یہ شوربہ دراصل شوربے دار مرغ کے شوربے کا شوربہ ہے۔''

یہ سنتے ہی اجنبیوں پر سکتہ طاری ہوگیا۔

عمر نے بھی چپ سادھ لی۔ مہمانوں کی سمجھ میں آ گیا کہ اس کی خاموشی کسی آنے والے طوفان کا اشارہ تھی۔ ان کے لیے واپسی کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔ □

◆ عظیم اقبال، ادبستان گنج، بیتیا، بہار 845438

خوشنودہ نیلوفر

دو ٹھگ

لوہار اور سنار دو گہرے دوست تھے۔ دونوں آس پاس کے گاؤں میں رہتے تھے۔ ایک دن سنار نے لوہار کو دعوت پر اپنے گھر بلایا۔ سنار کی بیوی اور سنار نے لوہار کی بہت خاطر مدارت کی۔ کھانا سونے کی پلیٹ میں پروسا۔ سونے کی پلیٹ دیکھ کر لوہار کی آنکھیں چوندھیا گئیں۔ سنار کی بیوی چوکے پر بیٹھی دونوں دوستوں کو کھانا پروس رہی تھی۔ اس نے کن انکھیوں سے مہمان کی آنکھیں پڑھ لیں۔

رات میں سنار اور اس کی بیوی گہری نیند سو گئے۔ مگر لوہار کی نیند غائب تھی۔ وہ کبھی اس کروٹ لیٹتا تو کبھی اس کروٹ۔ سب طرف سناٹا دیکھ کر وہ اپنی چارپائی سے اٹھا اور ہلکے ہلکے قدموں سے چلتا ہوا چولہے کے پاس پہنچا۔ پوری رسوئی چھان ماری مگر سونے کی پلیٹ نہیں ملی۔ وہ سنار کی بیوی کی چارپائی کی طرف بڑھا تو کیا دیکھتا ہے کہ چارپائی کے ٹھیک بیچوں بیچ اوپر چھپر میں ایک چھینکا ٹنگا ہے اور سونے کی پلیٹ اسی میں رکھی ہے۔ وہ ہولے ہولے چارپائی کے پاس پہنچا اور ایک انگلی پلیٹ میں ڈال کر دیکھی۔ پلیٹ میں پانی بھرا ہوا تھا، تاکہ کوئی اسے اتارنے کی کوشش کرے تو پانی کے چھلکنے سے نیچے سونے والے کو خبر ہو جائے۔ مگر لوہار بھی چالاک تھا۔ اس نے چولہے میں سے راکھ لاکر پلیٹ میں ڈال دی، دھیرے سے پلیٹ نیچے اتاری اور گھر سے کچھ دور ایک تالاب میں گھٹنوں بھر پانی میں گھس کر سونے کی پلیٹ گیلی مٹی میں دبا دی اور سوچا کل جب دوست کے گھر سے وداع ہو کر ادھر سے گزروں گا تب سونے کی پلیٹ نکال لوں گا۔ جلدی جلدی واپس لوٹا۔ گھر میں ابھی بھی سناٹا تھا۔ وہ اپنی چارپائی پر جا کر اطمینان سے سو گیا۔

سنار کی بیوی کی آنکھ تیسرے پہر کھلی تو سونے کی پلیٹ غائب

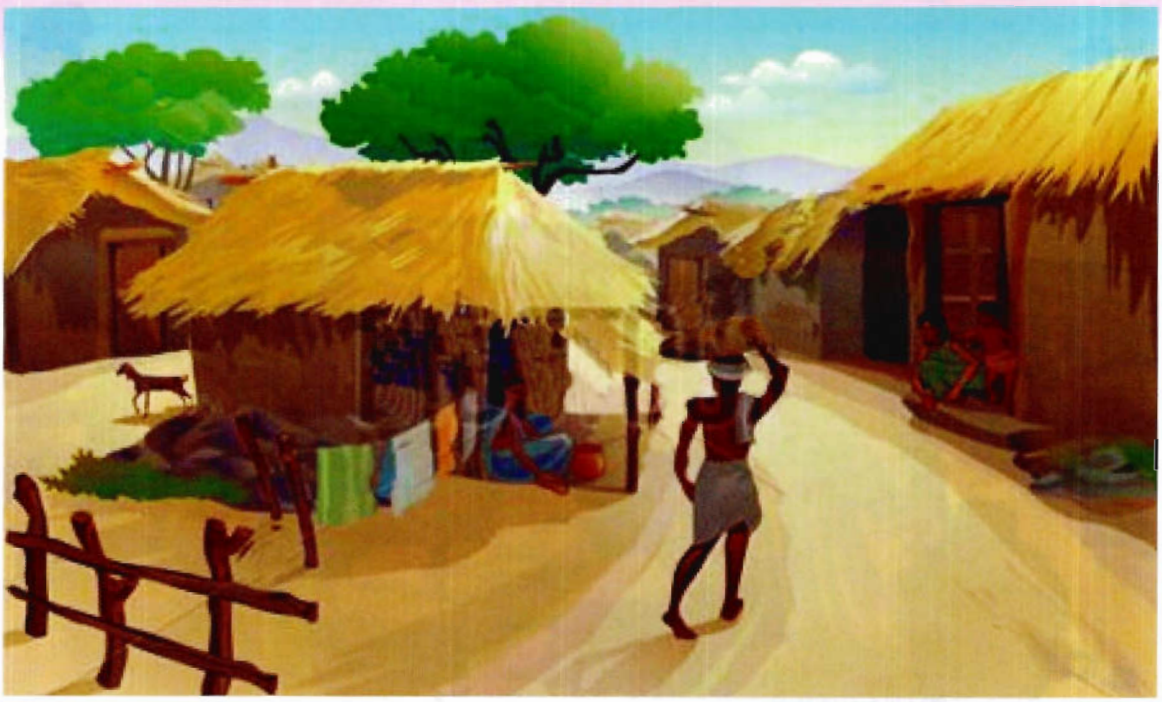

تھی۔ وہ اٹھ کر مہمان کی چارپائی کی طرف آئی۔ لوہار گہری نیند سو رہا تھا۔ اس کے پیروں کو غور سے دیکھا۔ پیروں پر پانی اور کیچڑ کے نشان دیکھ کر وہ تالاب کی طرف چل دی۔

صبح نہا دھو کر دونوں دوست پھر کھانے بیٹھے۔ سنار کی بیوی نے اپنے مہمان کو پھر سونے کی تھالی میں کھانا پروسا۔ لہار نے سونے کی تھالی کو چاروں طرف سے بغور دیکھا اور دل میں سوچنے لگا اس کے پاس کتنی تھالیاں ہیں سونے کی؟ لوہار کو اس طرح حیرت سے تھالی کو نہارتے ہوئے دیکھ کر سنار کی بیوی نے مسکرا کر کہا۔

''دیکھ کیا رہے ہیں بھیا؟ یہ وہی تھالی ہے، جسے رات آپ تالاب میں چھپا آئے تھے۔''

اپنے دوست لوہار کی طرف دیکھ کر سنار مسکرایا۔ ''بھائی! ہم تم سے چالاک، تم ہم سے چالاک۔ چلو کہیں ٹھگی کرتے ہیں۔''

کھا پی کر دونوں دوست چل پڑے۔

چلتے چلتے دونوں ایک راجہ کے علاقے میں پہنچے۔ ذرا آرام کرنے کے لیے ایک جگہ ٹھہرے تو کیا دیکھتے ہیں کہ لوگ زار و قطار رو پیٹ رہے ہیں۔ ہر طرف ماتم کا ماحول ہے۔ پوچھنے پر پتہ چلا کہ آج صبح یہاں کے راجہ کا انتقال ہو گیا ہے۔ اسی لئے رعایا رو رہی ہے۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور سیدھے شمشان کی طرف چل دیئے۔

چتا جل کر ٹھنڈی ہو چکی تھی لوگ باگ اپنے گھروں کی طرف واپس جا چکے تھے۔ لوہار نے سنار کو چتا کی راکھ میں چھپا دیا اور راجہ کے محل کے پاس پہنچ کر زور زور سے رونے لگا۔ اسے اس طرح روتا دیکھ کر آس پاس کے لوگ پوچھنے لگے ''بھائی ہم تو اپنے راجہ کی یاد میں رو پیٹ رہے ہیں۔ تم مسافر ہو۔ آخر تم کیوں رو رہے ہو؟''

بات ہوتے ہواتے راجہ کے محل تک پہنچی۔ راج کمار نے اس راہگیر کو بلوایا اور رونے کی وجہ پوچھی۔ اس نے کہا:

''بات یہ ہے کہ جب سورگ باسی راجہ جی مہاراج ٹھاکر دوارہ کی پوتر یاترا پر جا رہے تھے تو راستے میں ان کے پاس کچھ پیسہ کم پڑ گیا تھا

اورانھوں نے مجھ سے ادھار لیا تھا۔ میں اس لیے رو رہا ہوں کہ اب وہ تو رہے نہیں، میرا پیسہ کون دے گا؟ مسافر کی بات سن کر سب حیران تھے۔ بادشاہ کو آخر ایسی نوبت کیوں آئے گی کہ وہ کسی راہ گیر سے روپیہ ادھار لیں گے۔ حیرت سے سب ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

''ہم یقین کیسے کریں تمھاری بات پر؟'' راج کمار نے سوال کیا۔

''میری باتوں پر یقین نہیں ہے تو چلیے میں خود چل کر ان سے پوچھوا دیتا ہوں۔'' مسافر نے آنسو پونچھتے ہوئے جوب دیا۔

مسافر کے ساتھ سبھی شمشان کی طرف چل پڑے۔

''مہاراج ادھیراج جب آپ ٹھاکر دوارہ کی پوتریا ترا پر جا رہے تھے تو آپنے کسی راہ گیر سے روپے ادھار لئے تھے؟''

راج کمار نے بلند آواز میں پوچھا۔ راکھ کے ڈھیر سے آواز ابھری۔

''ہاں بیٹے میں نے سچ مچ روپے ادھار لیے تھے۔ میرا ادھار چکا دے تاکہ میں مکتی پاؤں۔''

سبھی واپس لوٹے اور مسافر کو اس کا روپیہ چکا دیا گیا۔ روپیہ ہاتھ آیا تو لوہار وہاں سے نو دو گیارہ ہو گیا۔ چتا میں لیٹے لیٹے جب شام ہوگئی اور لوہار نہیں لوٹا تو سنار سارا ماجرا سمجھ گیا۔

وہ راکھ کی ڈھیر سے باہر نکلا۔ بدن سے راکھ جھاڑی اور بازار کی طرف چل دیا۔

بازار سے ایک جوڑی جوتا خرید کر گھر کے راستے کی طرف آیا۔ راستے میں چلتے چلتے ایک پیر کا جوتا بیچ راہ میں گرا دیا۔ تھوڑی دور پہنچ کر دوسرے پیر کا جوتا بھی گرا دیا اور پاس کی جھاڑی میں چھپ کر بیٹھ گیا۔

لوہار اس راستے سے گزر رہا تھا تو اچانک اس کی نگاہ جوتے پر پڑی۔ جوتا ایک دم نیا۔ اس کا جی للچا گیا۔ آس پاس نظر دوڑائی

مگر ایک ہی پیر کا جوتا تھا۔ اس نے سوچا۔ ''کاش! دونوں پیروں کا ہوتا۔'' اسے وہیں چھوڑ کر بھاری دل کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔

تھوڑی دور نکل آنے کے بعد دور سے سڑک کے بیچوں بیچ کوئی چیز دکھائی دی۔ جلدی جلدی قدم بڑھاتے ہوئے وہاں پہنچا تو وہی جوتا۔ یہ دوسرے پیر کا تھا۔ اب پہلے والے کو پیچھے چھوڑ آنے کا اس کو بہت افسوس ہوا۔ چور چکار نہ مل جائے یہ سوچ کر پیسہ پاس کی جھاڑی میں چھپا دیا اور پہلے پیر کا جوتا لینے پیچھے چل پڑا۔

دونوں پیروں میں جوتے پہن کر وہ بہت خوش ہوا۔ مگر جب جھاڑی میں روپیہ لینے گیا تو روپیہ غائب تھا۔

اب ساری کہانی اس کی سمجھ میں آ گئی۔

لوہار روپیہ لے کر گھر آیا اور اپنے گاؤں کے باہر ایک سوکھے کنوئیں میں چھپ گیا۔ صبح شام لوہار کی بیوی اس کو کھانا ناشتہ وہیں دے جاتی۔

جب سنار واپس گھر آیا تو لوہار کی کوئی خبر نہیں ملی۔

ہمارے دوست کہاں ہیں؟ سنار نے لوہار کی بیوی سے پوچھا۔

کیا معلوم بھیا! جب سے آپ کے ساتھ گئے ہیں ابھی تک نہیں لوٹے۔'' بیوی نے جواب دیا۔

سنار خاموش ہو گیا۔ اس نے گاؤں گھر سے اس کی خبر لگانی شروع کی۔ ایک دن آٹے کی ایک موٹی سی روٹی بنوائی اور اس پر دھنیا مرچ کی چٹنی رکھ کر صبح سویرے کنوے پر پہنچ گیا۔ کنوے کی منڈیر سے ایک رسی لٹکائی۔ صبح صبح اتنا بیکار ناشتہ دیکھ کر لوہار کا موڈ خراب ہو گیا۔ ''یہ کیا لائی ہے ناشتے میں؟ اس کو تو جانور بھی نہیں کھا سکتا۔'' اس نے سخت

لہجے میں بیوی کو ڈانٹا۔

''کیا کروں جب گھر میں کچھ نہیں ہے پکانے کو؟'' کنوے کی منڈیر سے دبی زبان میں آواز آئی۔

''اری پاگل! چولہے کے پاس ہی تو روپیہ گاڑا ہے نکال کیوں نہیں لیتی؟

سنار نے جلدی جلدی رسی اوپر کھینچی اور وہاں سے چلتا بنا۔

تھوڑی ہی دیر میں ناشتہ لے کر لوہار کی بیوی کنوے پر پہنچی۔ نیچے رسی لٹکائی تو لوہار حیران ہوگیا۔ اتنی جلدی تو نے اتنی ساری اچھی چیزیں کیسے پکالی؟

''جلدی!'' بیوی نے حیران ہوکر پوچھا۔ ''میں تو اپنے وقت پر ہی آئی ہوں جیسے ہر دن آتیا کرتی ہوں۔''

''تو کیا تھوڑی دیر پہلے موٹی روٹی اور چٹنی لے کر تو نہیں آئی تھی؟'' اندر سے لوہار کی گھبراہٹ سے بھری آواز آئی۔

''نہیں۔ میں تو ابھی آرہی ہوں۔'' بیوی نے جواب دیا۔

''ارے بھاگوان جلدی نکال مجھے اس کنوے سے۔ وہ کم بخت سارے روپیہ لے گیا ہوگا۔''

سنار روپیہ لے کر گھر پہنچا اور ایک ایسی بیماری کا بہانہ کر چارپائی پر لیٹ گیا جس میں انسان نہ بول سکتا ہے اور نہ ہی کسی کو پہچان سکتا ہے۔ جب لوہار اس کے گھر پہنچا تو وہ کمزور سا بن کر چارپائی پر لیٹ چکا تھا۔

''کیا ہوگیا ہمارے دوست کو؟'' لوہار نے چارپائی کے پاس بیٹھتے ہوئے دوست کی خیریت دریافت کی۔

''پتہ نہیں کیا ہوگیا ہے بھیا۔ جب سے آپ کے ساتھ سے لوٹے ہیں نہ تو بولتے ہیں نہ ہی کسی کو پہچانتے ہیں۔'' سنار کی بیوی نے آنکھوں میں آنسو بھر کر جوب دیا۔

آخر دوست اچھے برے موقعے پر ہی تو کام آتے ہیں۔ آپ گھبرائیے نہیں۔ میں نے ایک حکیم سے نسخہ لیا ہے اس بیماری کا۔ اوپر والے کی مہر رہی تو ابھی اچھے ہو جائیں گے۔ آپ ذرا ایک کڑاہی میں تیل تو گرم کیجیے اور ایک روئی کا پھاہا بنائیے۔''

سنار کی بیوی نے تیل گرم کیا اور روئی کا پھاہا بنا کر لوہار کے ہاتھ میں تھما دیا۔

اب لوہار نے دوست کا علاج شروع کیا۔ کھولتے ہوئے گرم تیل میں روئی کا پھاہا ڈبو کر وہ سنار کے ننگے بدن پر تیل چھڑکنے لگا۔ سنار گرم تیل سے تلملا اٹھتا مگر دم سادھے پڑا تھا۔ بیوی اس کو اس طرح تڑپتے دیکھ کر بے چین ہو جاتی مگر خاموش تھی۔ لوہار نے پیٹ اور پیٹھ پر اس کو اچھی طرح داغا مگر سنار ٹس سے مس نہ ہوا۔

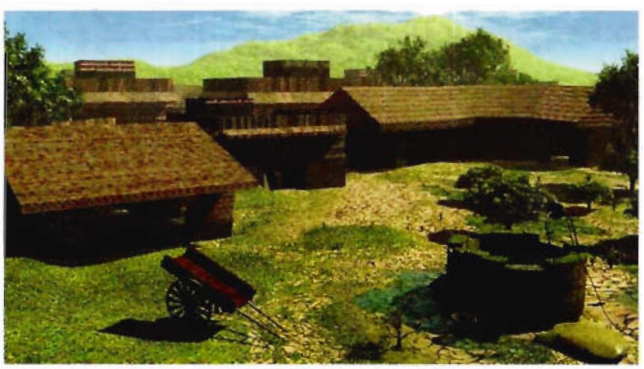

''اب کوئی امید نہیں ہے۔ میں نے سارا تجربہ آزما لیا۔ اب ان کی آخری یاترا کی تیاری کرنی چاہیے۔''

کفن لایا گیا۔ مردے کو نہلا دھلا کر کفن پہنا دیا گیا۔ چتا تیار کر کے آخری رسوم کے لئے سب شمشان پہنچے۔ اب لوہار ہاتھ میں آگ لے کر چتا کے چاروں طرف گھومنا شروع کیا۔ تیسرے پھیرے پر سنار کی بیوی کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ ''اب بول دیجیے نہیں تو یہ چتا میں آگ لگا دے گا۔'' بیوی نے دھیرے سے سنار کے کان میں کہا۔

وہ ابھی بھی چپ سادھے رہا۔ جب ساتواں چکر لینے کے بعد لوہار مردے کے سرہانے پہنچا اور آگ کی لپٹیں سنار کے سر کے پاس پہنچیں تو سنار اٹھ بیٹھا۔

''ارے یار! تم تو مجھے جلا دو گے۔ تم ہم سے چالاک، ہم تم سے چالاک۔ چلو جو روپیہ ہے بانٹ لیں۔'' □

♦ ڈاکٹر خوشنودہ نیلوفر، اگنور یجنل سینٹر 3/310 میرس روڈ علیگڈھ 202002

کہانی

□ محمد طارق صدیقی

ہوشیار کسان

ایک دن صبح کے وقت ایک کسان اپنا کھیت جوت رہا تھا۔ اچانک کہیں سے ایک بھالو آ گیا، بھالو کسان کو مارنے کے لئے جھپٹا، کسان نے خطرہ دیکھ کر بھالو سے کہا ''ارے بھالو بھائی مجھے مت مارو ذرا فصل آ جانے دو جو کہو گے وہی کھلاؤں گا۔''

بھالو نے اس کی بات مان لی اور بولا ''لیکن ایک بات سن لو۔ زمین میں جو کچھ پیدا ہوگا، اس کا آدھا حصہ میرا رہے گا۔''

کسان بھی راضی ہوگیا۔ اس نے بھالو سے پوچھا ''زمین کے اندر والا حصہ لوگے یا اوپر والا۔'' بھالو نے جواب دیا ''زمین کے اوپر کا حصہ میرا اور نیچے کا تمہارا رہے گا۔''

کسان نے کہا ''ٹھیک ہے۔ فصل تیار ہو تو آ جانا۔''

کسان نے زمین میں آلو بو دیئے۔ فصل تیار ہوگئی تو بھالو آ گیا۔ وعدے کے مطابق بھالو کو پتے کھانے کو ملے تو بھالو اور زیادہ چڑھ گیا۔ اب بھالو کچھ سوچ کر بولا ''دیکھو اس بار زمین کے نیچے کا حصہ میرا اور اوپر کا تمہارا رہے گا۔''

کسان نے کہا ''ٹھیک ہے بھالو جی، جیسی آپ کی مرضی۔''

اس بار کسان نے کھیت میں گیہوں بوئے۔ فصل تیار ہوگئی۔ بھالو پھر آ گیا بھالو کسان سے بولا ''لاؤ میرا حصہ۔''

کسان نے کہا ''لے لو اپنا حصہ۔'' کسان کو گیہوں ملے اور بھالو کو ملیں پودوں کی سوکھی جڑیں۔ بھالو کھسیا گیا۔

اس مرتبہ بھالو نے کسان کو مزا چکھانے کی ٹھان لی۔ بھالو کسان سے بولا۔

''اس دفعہ زمین کے اندر کی اور سب سے اوپر کی فصل میری ہو گی اور بیچ کا حصہ تمہارا ہوگا۔''

کسان نے کہا ''مجھے منظور ہے۔''

اب کی بار کسان نے گنا بو دیا۔

فصل تیار ہوئی تو بھالو پھر آ گیا اور آتے ہی کسان سے کہنے لگا ''لاؤ میرا حصہ۔''

کسان نے بیچ کا گنے والا حصہ نکال لیا جس سے بھالو، کو پتے اور جڑیں ملیں۔

داؤ الٹا پڑنے پر بھالو ایک بار پھر چکر کھا گیا۔

کسان واقعی بہت ہوشیار تھا۔ □

♦ محمد طارق صدیقی N-139-B-1 ابوالفضل اینکلو جامعہ نگر نئی دہلی 110025

لالچی شکاری

□ جی انیس احمد

کسی تالاب میں ایک کچھوا اور تالاب کے کنارے درخت پر ایک مور رہتا تھا۔ کچھوے اور مور میں بڑی گہری دوستی تھی ۔ ایک دن جب دونوں تالاب کے کنارے بیٹھے باتیں کر رہے تھے تو ایک شکاری ادھر پہنچا اور اس نے مور کو پکڑ کر ایک تھیلی میں بند کر دیا۔ کچھوے نے شکاری سے عاجزانہ درخواست کی کہ وہ مور کو رہا کر دے۔ شکاری نے جواب دیا ''میں اس خوبصورت جانور کو رہا نہیں کر سکتا ، بازار میں بیچوں گا تو اس کے بہت دام ملیں گے۔''

کچھوے نے کہا ''مور کی رہائی کے بدلے میں تالاب سے ایک موتی نکال کر تمہیں دوں گا، جس کے تمہیں اس سے بھی زیادہ دام مل جائیں گے۔'' یہ کہہ کر کچھوے نے غوطہ لگایا اور کچھ ہی دیر میں ایک چمک دار موتی لے کر تالاب کی سطح پر ابھر آیا۔ شکاری کی آنکھیں مارے حیرت کے اس موتی پر جمی رہ گئیں۔ موتی ایک اعلیٰ قسم کا تھا اور اس کے کافی دام مل سکتے تھے۔

شکاری نے فوراً مور کو رہا کر دیا اور موتی لے کر خوشی خوشی واپس چل دیا۔

ایک ہفتہ گزرنے کے بعد شکاری پھر اس تالاب کے پاس آیا۔ کچھوا کچھ ہی دیر پہلے تالاب سے باہر نکل کر ایک پتھر پر بیٹھا ہوا تھا۔ شکاری کو دیکھ کر وہ سمجھ گیا کہ ضرور کوئی بڑی مصیبت آنے والی ہے۔

کچھوے کو دیکھ کر شکاری نے کہا ''تم نے مجھے موتی دیا تھا وہ بہت قیمتی ہے لیکن اس کی قیمت اور دگنی ہو جاتی اگر ایک اور موتی اسی طرح کا مل جاتا۔ دونوں موتیوں کو کان کی بالیوں میں جڑ دیا جائے تو اس کی خوبصورتی بھی بڑھ جائے اور قیمت سوگنا ہو جائے ۔ کیا ہی اچھا ہو جو تم ایک اور موتی اسی طرح کا لا کر دے دو۔''

اگرچہ وہ موتی کے لیے کچھوے سے مدد مانگ رہا تھا لیکن اس کی آواز میں اکڑ اور دھمکی بھری ہوئی تھی۔

کچھوے نے کہا ''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، مگر پہلے تم وہ موتی مجھے دے دو تا کہ اس کے رنگ سے رنگ ملا کر کر ویسا ہی ایک اور موتی تمہیں لا دوں۔'' شکاری نے پہلے والا موتی کچھوے کے حوالہ کر دیا۔ کچھوا موتی ملتے ہی تالاب میں اتر گیا۔

''تمہیں واپس آنے میں کتنی دیر ہوگی۔'' شکاری نے سوا کچھوے سے پوچھا۔ کچھوے نے کہا ''ہو سکتا ہے میں کبھی واپس نہ آؤں۔ میرا دوست مور اور میں اچھی طرح جانتے تھے کہ تم ضرور لوٹ کر آؤ گے اور میں نے مور سے کہہ دیا تھا کہ وہ کسی دوسری جگہ جا کر اپنا گھر بنا لے۔ اب مجھے اپنے دوست کی کوئی فکر نہیں۔ وہ جہاں ہے مزے میں ہے۔'' یہ کہہ کر کچھوے نے غوطہ لگایا اور پانی کے اندر چلا گیا۔

شکاری حیران اور مایوس ہو کر بیٹھ گیا اور یہی سوچتا رہا کہ اگر اس نے لالچ نہ کیا ہوتا تو کتنا اچھا رہتا۔□

♦ جی انیس احمد، گلی 24، ایس آر اسٹریٹ، میل وشارم، ویلور تامل ناڈو 632509

ابرار احمد اعظمی

پرانی کہانی نئے لباس میں

کامڑیڈ فُرفُر

کسی ہوٹل کے مطبخ یعنی رسوئی گھر میں چوہوں کی ایک بڑی جماعت رہتی تھی۔ وہ ہر روز مطبخ میں جاتی اور بڑے ہی آرام واطمینان سے وہاں طرح طرح کے کھانوں اور پکوانوں کا مزہ لیتی تھی۔ اس طرح سے ان کی زندگی بہت ہی عیش اور آرام سے بسر ہو رہی تھی۔ ایک دن مطبخ میں ایک بلی آئی۔ بلی کو وہاں کی بو اور وہاں کی حالت سے ہی چوہوں کی موجودگی کا احساس ہوگیا۔ وہ اپنے شک کو یقین میں بدلنے کے لیے ایک کونے میں چھپ کر بیٹھ گئی۔ چوہے روز کی طرح بلوں سے باہر نکلے اور کھانوں پر ٹوٹ پڑے۔ بلی نے موقع پا کر ان پر حملہ کر دیا۔ اچانک حملے سے گھبرا کر چوہے اپنی بلوں میں چھپ گئے۔ لیکن بلی ایک چوہے کو پکڑنے میں کامیاب ہوگئی۔ اب بلی ہر روز یہی کرتی ان پر اچانک حملہ کرتی، ان میں سے ایک کو اچک لیتی اور چٹ کر جاتی۔

ایک زمانے تک چوہے جو کھم اور مصیبت بھری زندگی گزارتے رہے۔ جس کی وجہ سے ان کی تعداد کم ہونے لگی۔ دن بدن گھٹتی تعداد سے ان کا سردار بڑا فکر مند تھا۔ ایک دن اس نے تمام چوہوں کو جمع کیا اور کہا۔ ''ساتھیو! اب ہمارے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم اپنی ازلی دشمن بلی سے بچاؤ کی کوئی تدبیر سوچیں۔ اگر ہم نے ایسا نہیں کیا تو وہ دن دور نہیں جب ہماری نسل بھی ڈائناسور کی طرح اس دنیا سے ختم ہو جائے گی۔ اور لوگ ہماری بھی مختلف طرح کی خیالی تصویریں بنائیں گے اور یہ بتانے کی کوشش کریں گے کہ چوہے اس طرح کے ہوتے تھے۔''

سردار کی تقریر سے مجمع پر سناٹا طاری ہوگیا۔ سارے چوہے غور و فکر میں کھو گئے۔ بڑی دیر تک سوچ بچار کرنے کے بعد سردار نے کہا۔ ''ساتھیو! میں نے ایک بہترین تدبیر ڈھونڈلی ہے۔''

سردار کی آواز کو سننا تھا کہ تمام چوہوں کے کان کھڑے ہوگئے اور پورے دھیان سے سننے لگے۔ سردار نے کہا: ''اگر ہم بلی کے ظلم وستم سے نجات پانا چاہتے ہیں تو ہمیں بلی کی گردن میں ایک گھنٹی باندھنی ہوگی۔ اس کے بعد بلی جب آئے گی تو ہم دور سے ہی گھنٹی کی آواز سن کر اپنی بلوں میں چھپ جائیں گے۔ اور بلی کے حملے سے بچ جائیں گے۔'' سردار کی اس عمدہ تدبیر پر تمام چوہوں نے واہ واہ کی اور خوشی کی تالیاں بجائیں۔ چوہوں کے اس شور وغل اور چوں چوں کے بیچ ایک بوڑھا چوہا کھڑا ہوا اور اس نے کہا کہ تدبیر تو بہت ہی اچھی ہے مگر بلی کی گردن میں گھنٹی باندھے گا کون؟

بوڑھے چوہے کے اس سوال سے مجمع پر ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔ اپنی تجویز کو ناکام ہوتا دیکھ کر سردار کو غصہ آ گیا۔ اس نے انجام کی پرواہ کئے بغیر جوش میں اپنی مونچھ پر تاؤ دیتے ہوئے اور دانتوں کو پیستے ہوئے کہا۔ ''یہ کام میں خود کروں گا۔''

ایک بار پھر مطبخ تالیوں کی گڑگڑاہٹ سے گونج اٹھا۔ سردار ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اس تدبیر کو کس طرح عمل میں لایا جائے تبھی اس کی نظر مطبخ میں آتی بلی پر پڑی وہ بجلی کی سی تیزی سے اپنی بل کی طرف بھاگا۔ جس سے مجمع میں افراتفری مچ گئی۔

بلی کے جانے بعد تمام چوہے دوبارہ مطبخ میں اکٹھا ہوئے۔ سردار اپنی شرمندگی اور ناکامی کو چھپاتے ہوئے دوبارہ بولا۔ ''ساتھیو! کسی مظبوط اور طاقتور دشمن پر اکیلے قابو پانا بڑا مشکل کام ہے۔ میرے خیال میں اس سے نجات پانے کا سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ ہم سب مل کر اچانک بلی پر ہلّا بول دیں اور اسے موت کے گھاٹ اتار دیں۔ اس طرح سے ہمیں اس سے ہمیشہ ہمیش کے لئے نجات مل جائے گی۔''

سب نے سردار کی بات مان لی اور جب بلی آئی تو تمام چوہوں نے ایک ساتھ اس پر حملہ کر دیا۔ لیکن بلی طاقت ور بھی تھی اور پھرتیلی بھی۔ اس نے ان میں سے ایک کو اچک لیا اور چٹ کر گئی۔

تمام چوہے اپنی ناکامی پر بہت ہی غمگین تھے۔ وہ بالکل ناامید ہو چکے تھے۔ بس انہیں سردار کے حکم کا انتظار تھا۔ اس سے پہلے کہ سردار کچھ کہتا ایک نوجوان چوہا جس کا نام فُرفُر تھا کھڑا ہوا اور بولا۔ ''ساتھیو! آپ سب کی کیا رائے ہے اگر ہم فرش پر لکڑی چپکانے والا سفید گوند ڈال دیں اور وہاں گوشت کا ایک ٹکڑا رکھ دیں تو جب بلی گوشت کھانے آئے گی تو فرش سے چپک جائے گی اور ہم آسانی سے اس کی گردن میں گھنٹی باندھ دیں گے۔''

فُرفُر کی اس شاندار تدبیر نے ان کے مردہ جسموں میں جان ڈال دی۔ وہ سب اچھل پڑے اور فوراً اس تدبیر کو عملی جامہ پہنانے کے لیے تیار ہو گئے۔ وہیں لکڑی والے گوند کی ایک بڑی بوتل رکھی ہوئی تھی۔ سب نے زور لگا کر بوتل لڑھکا دی۔ گرتے ہی بوتل کے ٹکڑے ہو گئے اور سارا سفید گوند فرش پر پھیل گیا۔ اس کے بعد چوہوں نے بڑا سا گوشت کا ایک ٹکڑا گھسیٹا اور اسے اونچائی سے فرش پر پھینک دیا۔ اب وہ دور کھڑے ہو کر بلی کے آنے کا انتظار کرنے لگے۔ وہ یہ سوچ کر خوش ہو رہے تھے کہ بلی یقیناً اب ان کے جال میں پھنس جائے گی اور ان کا خیال واقعی سچ نکلا۔

بلی آئی اور جیسے ہی اس کی نظر گوشت کے ٹکڑے پر پڑی اس نے نہ آگے دیکھا نہ پیچھے ایک دم گوشت پر جھپٹ پڑی۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ گوشت کے ٹکڑے تک پہنچ پاتی اس کے پاؤں پوری طرح گوند سے چپک چکے تھے۔ اب وہ حرکت نہیں کر سکتی تھی۔ چوہوں نے موقع غنیمت جانا اور گھنٹی لے آئے۔ فُرفُر اوپر سے چھلانگ لگا کر بلی کی پیٹھ پر چڑھ گیا اور اس کی گردن میں گھنٹی باندھ دی۔ تمام چوہے اپنی ازلی دشمن بلی کی اس نادانی پر ہنس رہے تھے۔ بلی جب جب پاؤں سے گوند چھڑانے کی کوشش کرتی گھنٹی خوب بجتی اور چوہے بلی کی ناکامی پر مسرور ہوتے۔ لیکن پھر ایک عجیب بات ہوئی۔

گھنٹی کا شور سن کر مطبخ کا نگراں مطبخ میں آ گیا۔ اس نے دیکھا کہ اس کے قیمتی گوند کو بلی نے برباد کر دیا ہے تو وہ غصے سے لال ہو گیا اور اس نے ڈنڈے سے پیٹ پیٹ کر بلی کی کمر توڑ دی۔ بے چاری بلی کسی طرح جان بچا کر لنگڑاتی ہوئی باہر نکلی اور پھر کبھی دکھائی نہیں دی۔

کامڑیڈ فُرفُر کی عقل مندی پر تمام چوہوں نے تالیاں بجا کر نعرے لگاتے ہوئے اسے اپنے کندھوں پر اٹھا لیا اور بلند آواز میں نعرے لگانے لگے۔ ''کامڑیڈ فُرفُر کو لال سلام ... کامڑیڈ فُرفُر تم آگے بڑھو ہم تمہارے ساتھ ہیں ... کامڑیڈ فُرفُر زندہ باد ... کامڑیڈ فُرفُر زندہ باد ...'' □

● ابرار احمد اعظمی 155 سابر متی ہاسٹل جے این یو نئی دہلی 110067

ننھے میاں
ننھا باربر
ترجمہ: سید مکرم نیاز

ابو، کیا مجھے آئس کریم کون کے لیے روپے مل سکتے ہیں؟
نہیں! ننھے میاں

جب تم کماؤ گے تو روپے کی قدر بھی کرو گے
مجھے قدر نہیں کرنی آئس کریم کھانی ہے!

سلام ننھے یار! کیا مسئلہ ہے؟ کیوں ایسے بیٹھے ہو؟
آں مجھے آئس کریم کے لیے روپے چاہیے تھے مانگنے پر بھی ابو نے نہیں دیے..

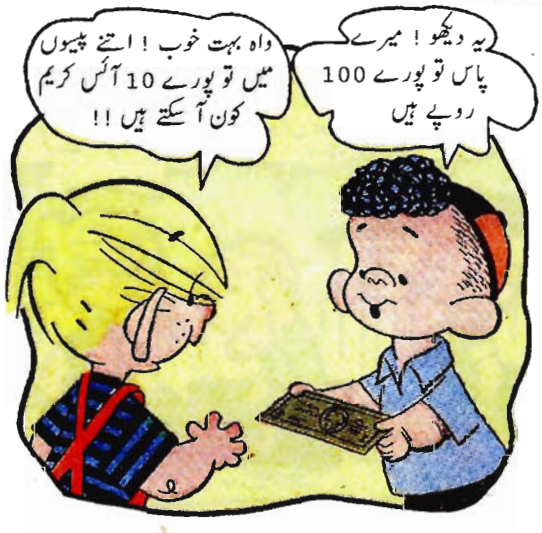
یہ دیکھو! میرے پاس تو پورے 100 روپے ہیں
واہ بہت خوب! اتنے پیسوں میں تو پورے 10 آئس کریم کون آ سکتے ہیں!!

ہاں وہ تو ہے، مگر یہ پیسے بال کٹوانے کے ہیں...
اوہ... آئیڈیا!! فرض کرو میں تمہارے بال بنا دیتا ہوں، تب تو پھر ہم ڈھیر ساری آئسکریم کھا سکتے ہیں، کیوں؟

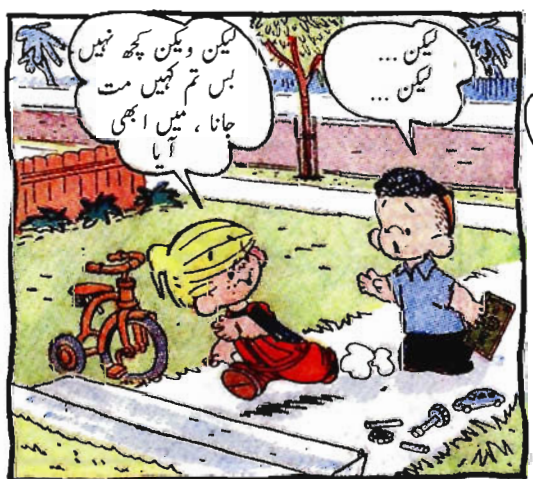
لیکن... لیکن...
لیکن ویکن کچھ نہیں بس تم کہیں مت جانا، میں ابھی آیا

کیا میں یہ لے سکتا ہوں مما؟
میں نے لے لی ہے۔ شکریہ مما۔
اب میری باری ننھے میاں ... میں!
یہ صرف لڑکوں کی باربر شاپ ہے!
ہی ہی مجھے گدگدی ہو رہی
اوہ ... یہاں تو حجام کی دکان سے بھی زیادہ بال گرے نظر آ رہے
مجھے تو اپنے بال ناہموار محسوس ہو رہے
کیا اب ہم سب مل کر کھیل سکتے؟
چلو چلو جاؤ یہاں سے، ہم بہت مصروف ہیں ...
الجھے بکھرے بالوں والی لڑکی ...
نہیں نہیں! میں نہیں!
الجھے بکھرے بالوں والی لڑکی
اچھا، میں اپنے بال تم سے چھوٹے کروا لوں تب تمہارے ساتھ کھیل سکوں گی ناں؟
اوہ ہو ایسا کیا؟ پھر تو ٹھیک ہے
مگر ذرا اچھا تراشنا
آرام سے بیٹھو اور بے فکر رہو میں ہوں نائی!
قطار بناؤ قطار سے آؤ!
ننھے میاں میں بھی ہوں
اگلی باری میری
خاموش! اگلی میں ہوں

ننھے میاں، یہ آئسکریم تمہیں کہاں سے ملی؟
چھوٹو اور میں، ہم دونوں نے مل کر دس دس کھائے ہیں

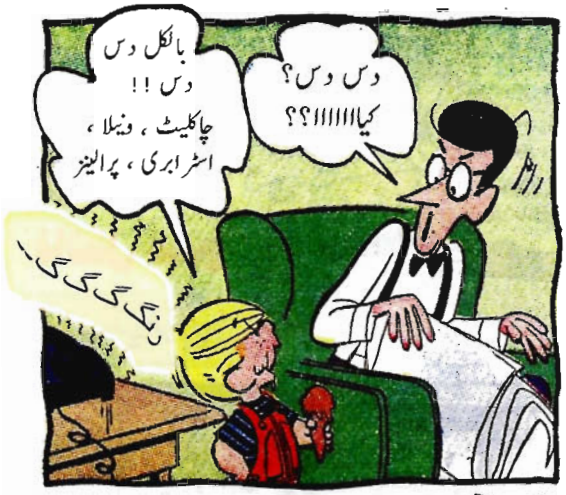
دس دس؟ کیاااااا؟؟
بالکل دس دس!! چاکلیٹ، وینلا، اسٹرابری، پرالینز
رنگ گ گ گ۔۔۔

اس کے بال بنائے گئے؟ اچھی بات ہے۔۔۔
اور سب نے ہم کو بال بنانے کی ادائیگی کی۔۔۔

ننھے میاں نے بال کاٹے؟
کیاااا؟

ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔۔۔ میں درست بال بنوائی کی رقم ادا کروں گا، جی اس کی بھی، ہاں ہاں اس کی بھی۔۔
اب کیا کر ڈالا ہے تم نے آخر؟

ابو نے کہا تھا کہ پیسے کماؤ خود، تو میں نے یہی کیا!
کتنا نقصان کر ڈالا ہے ننھے نے؟
آٹھ بچوں کے بال پھر سے بنوانے کی رقم ادا کرنا ہے مجھے اب!

کیا تمہیں معلوم ہے کہ پورے 80 آئس کریم کی قیمت کے برابر رقم مجھے اب نائی کو ادا کرنا ہوگی
افوہ! یہ نائی آخر 80 آئس کریم کیسے ہضم کرے گا پھر؟
ختم شد

ٹام اور جیری

فائنل میچ

ترجمہ: سید مکرم نیاز

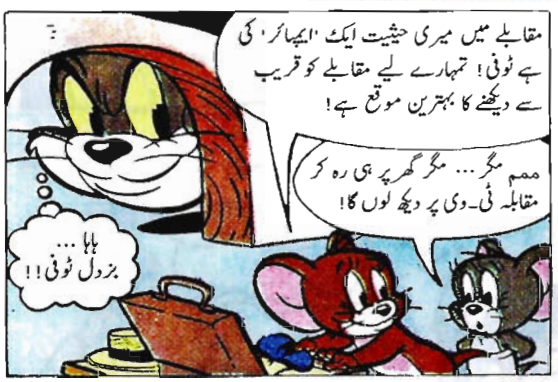

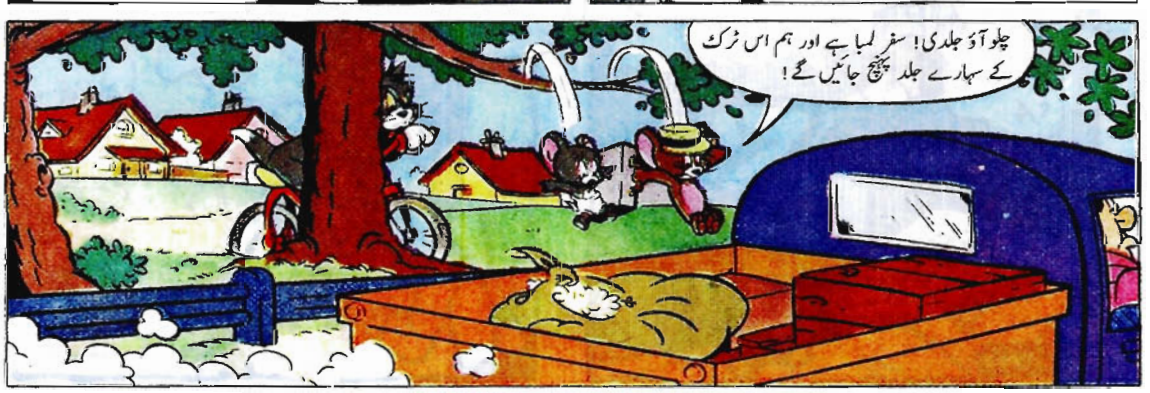

ارے باپ رے! یہاں تو کافی چڑھاؤ ہے، میں نے اس کا گمان نہیں کیا تھا ...
افففف
لیکن بہرحال محنت کا پھل ملے گا
اہاااا ... چوہوں کا ہجوم ...
یہ تو میری سال بھر کی غذا ہوگی!
میں اوپر چھت سے نیچے ان سب پر کودوں گا، اس طرح دہشت کے مارے وہ کچھ بھی حرکت نہ کر پائیں گے
اووووو !!
ٹام کے پاؤں میں ایک ابھری ہوئی کیل چبھ گئی

ماخذ: ڈزنی لینڈ کامکس کا پرانا اسٹاک؛ پیشکش: www.urdukidzcartoon.com

ادارہ

نومبر واقعات کے آئینے میں

شمسی سال اور گریگورین عیسوی کلینڈر کا گیارہواں مہینہ نومبر، 30 دن کا مہینہ ہے مگر عیسوی کلینڈر سے پہلے رائج پرانے رومن کلینڈر میں یہ 9واں مہینہ تھا چنانچہ اسی وجہ سے نومبر کہلاتا تھا۔ لاطینی زبان کے novem سنسکرت کے نَوم اور فارسی کے نہم کا مطلب 9 ہی ہے جو اردو میں نو ہو جاتا ہے۔ یہ ہم آپ کو پہلے ہی بتا چکے ہیں کہ رومن کلینڈر میں مارچ سال کا پہلا مہینہ ہوا کرتا تھا۔ نومبر کی پہلی تاریخ ہر سال اسی دن ہوتی ہے جس دن مارچ کی پہلی، اور آخری تاریخ اس روز جس روز اگست کی آخری تاریخ پڑتی ہے۔ اور اب دیکھتے ہیں کہ ہمارے ملک میں اور باقی دنیا میں اس مہینے کے دوران کون سے اہم واقعات پیش آئے۔

یکم نومبر: 1954 کو ہندوستان نے فرنچ انڈین آبادیوں کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ 1956 میں ریاست کیرالہ قائم ہوئی۔ 1848 میں عورتوں کا پہلا میڈیکل اسکول بوسٹن میں قائم ہوا جس میں صرف 12 لڑکیوں نے داخلہ لیا تھا۔ اس کا نام بوسٹن فیمیل میڈیکل اسکول رکھا گیا اور اسے سیموئل گریگوری نے قائم کیا تھا۔ 1874 میں یہ بوسٹن یونی ورسٹی کا حصہ بن گیا۔ جنوبی افریقہ میں 1995 میں اس روز تمام نسلوں کے لوگوں نے قومی چناؤ میں حصہ لیا جس کے ساتھ ملک میں نسل پرستی کی سرکاری پالیسی کا خاتمہ ہو گیا، ورنہ اس سے پہلے سب کچھ یوروپ کے گورے لوگوں کے ہاتھ میں تھا اور کالے یا رنگ دار افریقی اور ہندوستانی وہاں ذلت بھری زندگی گزار رہے تھے۔

2 نومبر: 1947 کو امریکہ کے لانگ بیچ ہاربر پر ہاورڈ ہیوز کی 'اڑن کشتی' نے صرف 70 فٹ کی اونچائی پر ایک میل تک اڑان بھری اور پھر پانی میں تیرنے لگی۔ پانی کے جہاز جتنی بڑی اس 'اڑن کشتی' کی عرفیت اسپروس گوز Spruce Goose تھی اور اس کا نام ہرکیولس رکھا گیا تھا۔ 200 ٹن وزنی ہرکیولس پر ڈھائی کروڑ ڈالر کا خرچ آیا اور یہ اس وقت دنیا کا سب سے بڑا ہوائی جہاز تھا جو پلائی وڈ سے بنایا گیا تھا۔

3 نومبر: 1838 کو ٹائمس آف انڈیا کی اشاعت بامبے ٹائمس اینڈ جرنل آف کامرس کے نام سے شروع ہوئی۔ آج ٹائمس آف انڈیا براڈ شیٹ پر دنیا کا سب سے زیادہ چھپنے والا انگریزی اخبار ہے۔ 31 اکتوبر 1984 کی شام شروع ہونے والے سکھ مخالف دنگوں میں ہلاک ہونے والے سکھوں کی تعداد تین ہزار تک پہنچ گئی۔ مغل بادشاہ اورنگ زیب 1618 میں پیدا ہوا۔

4 نومبر: مصر میں لکسور Luxor کے مقام پر 1922 میں اس روز انگریز ماہرین نے مصر کے بادشاہ توتن خامن کی ممی ڈھونڈ نکالی جو حضرت

گولڈن ماسک سے ڈھکی توتن خامن کی ممی ◄

توتن خامن کی کمپیوٹرائزڈ تصویر اور اس کی ممی اصل حالت میں

عیسیٰ کی ولادت سے 1352 سال پہلے 19 سال کی عمر میں فوت ہوا تھا اور صرف 9 سال کی عمر میں بادشاہ بن کر اس نے فرعونِ مصر کا لقب اختیار کیا تھا۔ اس کی مومیائی ہوئی لاش کے ساتھ بہت سی بیش قیمت چیزیں جوں کی توں ملیں جو اَب مصر کی راجدھانی قاہرہ کے نیشنل میوزیم میں رکھی ہوئی ہیں۔ 1890 میں بجلی سے زمین کے نیچے چلنے والی پہلی ریلوے سروس کا لندن میں باقاعدہ آغاز ہوا۔ 1979 میں تقریباً 500 ایرانی جنگ جولڑاکوں نے تہران میں امریکہ کے سفارت خانے میں 90 لوگوں کو یرغمال (قیدی) بنالیا جن میں 52 امریکی تھے انھیں 444 دنوں تک یرغمال بنائے رکھا گیا اور یہ اپنی طرح کا ایک عجیب واقعہ تھا۔ 1995 میں اسرائیل کے وزیراعظم اسحاق رابن کا قتل ہوا۔

5 نومبر: 1961 کو وزیراعظم پنڈت جواہر لال نہرو نیویارک پہنچے۔

جواہر لال نہرو امریکی صدر جان کینیڈی کے ساتھ

6 نومبر: نیپال کے بادشاہ تری بھون بھاگ کر ہندوستان آ گئے۔ 1429 کو ہنری vi نے آٹھ سال کی عمر انگلینڈ کے بادشاہ کا تاج پہنا۔ شاہ چارلس vi کی موت کے بعد اسے اس وقت شاہی تخت کا وارث قرار دے دیا گیا تھا جب وہ صرف 9 مہینے کا تھا۔ 1860 میں ابراہم لنکن امریکہ کے 16 ویں صدر چنے گئے۔

7 نومبر: 1930 میں نوبل انعام پانے والے فزکس کے سائنس داں چندر شیکھر وینکٹ رمن 1888 میں پیدا ہوئے۔ 1885 کو امریکہ میں لوگوں کو غلام بنانے کی حمایت کرنے والوں کے ہجوم نے ایلٹن میں ایلیجا لو جوائے کو ان کے پرنٹنگ پریس میں قتل کر دیا کیوں کہ وہ انسانوں کے ذریعے

سی وی رمن

انسان کو غلام بنانے پر پابندی لگانے کی مانگ کر رہے تھے۔ 1867 میں میری کیوری کی پولینڈ کے وارسا شہر میں پیدائش ہوئی جنھوں نے 1903 میں اپنے شوہر کے ساتھ ملکر ریڈیم کی دریافت کی اور اس کے لیے انھیں فزکس کا نوبل پرائز دیا گیا۔ مادام کیوری کی ریڈیم کے اثرات سے ہی موت ہوئی۔

8 نومبر: 1895 کو ولیم روئنٹین نے جرمنی کی ورزبرگ یونی ورسٹی میں ایکس ریز (الیکٹرومیگنیٹک ریز) کا پتہ لگایا۔ ستاروں کے علم کے ماہر ایڈمنڈ ہیلی 1656 میں لندن میں پیدا ہوئے جنھوں نے 1682 میں گریٹ کامیٹ Great Comet کا پتہ لگایا اور حساب لگا کر بتایا کہ یہ دُم دار ستارہ 1758 میں پھر دکھائی دے گا۔ یہ پیشین گوئی درست نکلی اور ثابت ہوا کہ یہ ستارہ اوسطاً ہر 76 برس بعد دکھائی دیتا ہے۔ بعد میں اس کا نام ہیلی کامیٹ رکھ دیا گیا۔ اب یہ ستارہ 2061 میں پھر دکھائی دے گا۔ 1847 میں بے حد ڈراؤنے ناول ڈراکیولا کے مصنف برام اسٹوکر، ڈبلن (آئرلینڈ) میں پیدا ہوئے۔ امریکہ کی خانہ جنگی کے پس منظر میں لکھے گئے رومانی ناول گون ود دی ونڈ Gone with the wind کی مصنفہ مارگریٹ مچل 1900 میں جارجیا امریکہ کے شہر اٹلانٹا میں پیدا ہوئیں۔ اس ناول کی ایک کروڑ

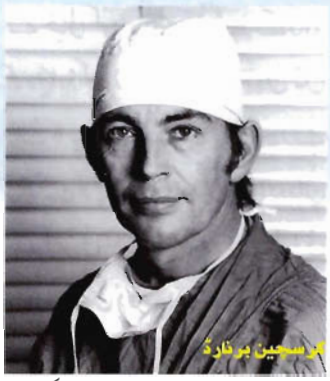

کرسچین برنارڈ

سے زیادہ جلدیں بک چکی ہیں، 30 زبانوں میں اس کا ترجمہ ہوا ہے، ایک بے حد کامیاب فلم اسی نام سے بن چکی ہے اور 1937 میں مارگریٹ کو اس کے لیے پلٹزر انعام بھی ملا۔ 1949 میں ایک کار حادثہ میں ان کی موت ہوئی۔ 1967 میں پہلی بار کسی انسان کا دل بدل کر دوسرا دل لگانے میں کامیاب رہنے والے سرجن کرسچین برنارڈ 1922 میں جنوبی افریقہ میں پیدا ہوئے۔

9 نومبر: 2005 کو سابق صدر جمہوریہ کے آر نرائنن کا انتقال ہوا۔ 1918 کو جرمنی کے بادشاہ قیصر ولیم نے پہلی عالمی جنگ کے آخری دنوں میں تخت چھوڑ دیا اور ہالینڈ بھاگ گیا جس کے بعد سوشلسٹ لیڈر رفلپ شائڈ مین جرمنی کو جمہوری ملک قرار دے کر اس کا پہلا چانسلر بن گیا۔

قیصر ولیم

1965 میں اس روز شام 5 بج کر 16 منٹ پر امریکہ کے شمال مشرق میں بجلی چلی گئی جس سے 80 ہزار مربع میل رقبے میں امریکہ کے 3 کروڑ لوگوں کو اندھیرے میں رہنا پڑا اور اونٹاریو اور کیوبیک میں بھی بجلی فیل ہوگئی۔ بجلی کی نارمل سپلائی 13 گھنٹے بعد بحال ہوسکی۔ امریکی اسے گریٹ بلیک آؤٹ کہتے ہیں۔ 1989 میں برلن (جرمنی) کی دیوار 28 سال بعد دونوں طرف کے لوگوں کے لیے کھول دی گئی۔ تقریباً 28 میل لمبی یہ دیوار 1961 میں بنائی گئی تھی۔

ڈیوڈ لونگ اسٹون

10 نومبر: عیسائیت کی تبلیغ کرنے والے طبیب، سائنسداں، افریقہ میں دریائے نیل کے شروع ہونے کا مقام ڈھونڈنے اور وکٹوریا آبشار کا پتہ لگانے والے برطانیہ کے ہیرو ڈاکٹر ڈیوڈ لونگ اسٹون Dr David Livingstone اپنی زندگی کے آخری چھ برسوں میں پوری دنیا سے رابطہ ختم کرکے پراسرار طور پر لاپتہ ہوگئے تھے جنھیں ڈھونڈنے کے لیے اخبار نیویارک جرنل نے ہنری مارٹن اسٹین لے کو 1869 میں افریقہ بھیجا اور 10 نومبر 1871 کو انھیں ٹانگانیکا جھیل کے کنارے اُجی جی کے مقام پر ڈھونڈ لیا۔ انھیں دیکھتے ہی مارٹن نے کہا، ''ڈاکٹر لونگ اسٹون، آئی پریزیوم!'' Dr Livingstone I presume?۔ اس سادہ سے جملے کو، جس کا مطلب ہے ''میرا خیال ہے آپ ڈاکٹر لونگ اسٹون ہیں؟'' انگریزی ادب میں ایک خاص شہرت حاصل ہے۔ جواب میں ڈاکٹر لونگ اسٹون نے کہا تھا، ''یس۔ Yes'' 1483 میں اصلاح پسند جرمن عیسائی پادری مارٹن لوتھر، رومن ایمپائر کے آئل بین سیکسونی میں پیدا ہوئے جنھوں نے وٹن برگ محل کے چرچ کے دروازے پر اپنی اُن 95 تھیسسوں کے کاغذ لٹکا دیے جن میں اس بات پر زور دیا گیا تھا کہ بائبل کو چرچ کی واحد اتھارٹی مانا جائے اور رومن کیتھولک چرچ کی دوبارہ تشکیل ہونی چاہیے۔ ان ہی کے نظریوں پر عیسائیوں کے پروٹسٹنٹ فرقے کی بنیاد پڑی۔

مارٹن لوتھر

11 نومبر: 1888 کو مولانا ابوالکلام آزاد مکّہ شریف میں پیدا ہوئے اور آزادی کے بعد ملک کے پہلے وزیر تعلیم بنائے گئے۔ 1821 میں ماسکو میں مشہور روسی مصنف فیودور دوستوفسکی کی پیدائش ہوئی جن کے ناول کرائم اینڈ پنشمنٹ، دی بردرز کراماز وو اور دی ایڈیٹ دنیا بھر میں مشہور ہیں۔

مولانا آزاد

ظہیر عباس

12 نومبر: 1982 کو ظہیر عباس کے نام سے مشہور سید ظہیر عباس کرمانی نے فرسٹ کلاس کرکٹ میں 100 ویں سنچری مکمل کی۔ 1923 کو ایڈولف ہٹلر جرمنی میں حکومت کا تختہ الٹنے کی ناکام سازش کے سلسلے میں گرفتار ہوا۔ 1982 میں لیونید بریژنیف کے انتقال پر یوری آندروپوف کو سوویت کمیونسٹ پارٹی کا فرسٹ سیکریٹری منتخب کیا گیا۔

13 نومبر: 1945 کو آسٹریلیا سروسز نے ہندوستان کے خلاف پہلا کرکٹ ٹیسٹ جیت لیا۔ 1945 کو جنرل چارلس ڈی گال فرانس کی عارضی حکومت کے صدر مقرر کیے گئے مگر طویل عرصے تک فرانس کی سیاست ان کی مٹھی میں رہی۔ 1956 میں امریکی سپریم کورٹ نے رولنگ دی کہ سرکاری بسوں میں کالوں اور گوروں کو ان کے رنگ کی بنیاد پر الگ الگ سیٹیں دینا امریکی آئین کے خلاف ہے۔ اسکاٹ لینڈ کے مشہور برطانوی مصنف رابرٹ لوئی اسٹی وینسن، اسکاٹ لینڈ کے اڈین برا میں 1850 میں پیدا ہوئے۔ ان کے تین ناول ٹریژر آئی لینڈ، کڈ نیپڈ اور دی اسٹرینج کیس آف ڈاکٹر جیکل اینڈ مسٹر ہائیڈ بے حد مشہور ہیں۔

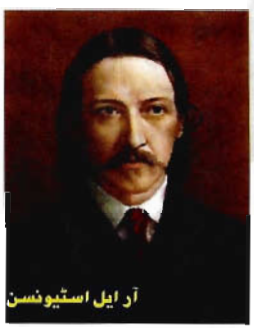
آر ایل اسٹیونسن

14 نومبر: 1889 کو ہندوستان کے پہلے وزیراعظم پنڈت جواہر لال نہرو الہ آباد میں پیدا ہوئے۔ 1967 میں ہندوستان کے لیے 7 کرکٹ ٹیسٹ میچ کھیلنے والے کرنل سی کے نائیڈو کا انتقال ہوا۔ 1666 کو پورے جسم کے خون کو بدلنے Blood Transfusion کا پہلا کامیاب تجربہ لندن میں ہوا جو دو کتوں پر کیا گیا۔ برطانوی مہم جو جیمس بروس نے پہلی بار 1770 میں پتہ لگایا کہ مصر کا دریائے نیل ایتھوپیا کے شمال مغرب میں تانا جھیل سے نکلتا ہے۔ 1889 میں نیویارک کی اخباری رپورٹر نیلی بلائی

نیلی بلائی

مشہور مصنف جولز ورنے کے خیالی کردار فلیس فوگ کے 80 دنوں میں دنیا کا چکّر لگانے کے ریکارڈ کو توڑنے نکلی اور 72 دن میں نیویارک واپس آ گئی۔ جولز ورنے کا یہ ناول آپ قسط وار پڑھ رہے ہیں۔ نیلی جس کا اصل نام الزبتھ جین کوچرین تھا، فرانس میں دورانِ سفر جولز ورنے سے بھی ملی۔ ایک امریکی اخبار کاسمو پولیٹن نے اپنی رپورٹر الزبتھ بسلینڈ کو اس کے مقابلے میں دوسری جانب سے دنیا کا سفر مکمل کرنے بھیجا مگر وہ پچھڑ گئی۔

15 نومبر: 2000 کو نئی جھارکھنڈ ریاست وجود میں آئی۔ 1889 میں برازیل ایک ری پبلک (جمہوریہ) بن گیا۔ 1943 میں جرمنی میں ہٹلر کے وزیر ہینرخ ہملر نے جپسیوں کو کنسنٹریشن کیمپوں میں رکھنے کا حکم جاری کر دیا۔ نازی حکومت کے ہاتھوں اندازاً 5 لاکھ یہودی مارے گئے۔ یہودیوں اور جپسیوں کا صفایا کرنے کے اس دور کو ہولوکاسٹ Holocaust یعنی مکمل تباہی اور قتل عام کہا جاتا ہے۔

16 نومبر: 1983 کو کپل دیو نے ویسٹ انڈیز کے 83 رن پر 9 وکٹ لیے اس کے باوجود ہندوستان احمد آباد میں کھیلا گیا یہ ٹیسٹ میچ ہار گیا۔ 1918 کو ہنگری آزاد جمہوریہ بنا۔ 1933 میں امریکی صدر فرینکلن روز ویلٹ نے سوویت یونین سے 1919 میں توڑے گئے سفارتی تعلقات دوبارہ قائم ہونے کا اعلان کیا۔ اقوام متحدہ نے 1995 میں بوسنیا کے سرب لیڈر رادووان کرازک اور اس کے ملٹری کمانڈر ریٹکو ملادک کو نسل کشی کا ملزم ٹھہرایا۔

جمال عبد الناصر

17 نومبر: 1954 کو جنرل جمال عبدالناصر، جنرل نجیب کی حکومت کا تختہ الٹ کر مصر کے حکمراں بن گئے۔

18 نومبر: 1477 کو ولیم کاکسٹن نے انگریزی میں پہلی کتاب چھاپی جس کا نام اس وقت کے انگریزی املا کے مطابق The Dictes and Sayengis of the Phylosophers تھا۔ 1916 میں پہلی عالمی جنگ کے دوران اتحادیوں کے سپہ سالار جنرل ڈگلس ہیگ

نے Somme کی پہلی لڑائی کے خاتمے کا اعلان کیا۔ 5 مہینوں کی اس لڑائی میں اتحادی فوجیں 125 میل آگے بڑھیں، جس کے لیے 4 لاکھ 20 ہزار برطانوی اور 1 لاکھ 95 ہزار فرانسیسی فوجیوں کی جانیں گئیں اور جرمنی کے 6 لاکھ 50 ہزار فوجی مارے گئے۔ فوٹو گرافی کی ایجاد کرنے والے لوئیس دیگویرے 1789 میں پیرس کے نزدیک پیدا ہوئے۔

19 نومبر: 1917 کو ملک کی رہنما اور وزیر اعظم محترمہ اندرا گاندھی الہ آباد میں پیدا ہوئیں۔ 1994 میں ایشوریہ رائے 21 سال کی عمر میں مس ورلڈ چنی گئیں۔ 1977 میں مصر کے صدر انور سادات نے اسرائیل کا دورہ کیا۔ ایسا کرنے والے وہ پہلے عرب لیڈر تھے۔ 1942 میں روسی فوج نے دوسری عالمی جنگ کے دوران اسٹالن گراد کو بچانے کے لیے جرمن فوج کے خلاف زبردست جنگ شروع کی جس کا آخری نتیجہ ہٹلر کی ہار کی صورت میں نکلا۔ ایک اندازے کے مطابق اس عالمی جنگ میں اکیلے سوویت یونین کے دو کروڑ لوگوں کی جانیں گئیں جب کہ اتنے لوگ باقی دنیا کے تمام ملکوں میں کل ملا کر مارے گئے تھے۔

1978 میں اس روز اجتماعی خودکشی سب سے بڑا اور ہولناک واقعہ رونما ہوا جب جونس ٹاؤن گیانا میں ریورینڈ جم جونز کے کہنے پر اس کے 'پیپلز ٹیمپل' People's Temple فرقے کے 900 لوگوں نے سائنائڈ ملا ہوا پھلوں کا رس پی کر خود کو ہلاک کر لیا۔ جن لوگوں نے موت کا یہ جام پینے سے انکار کیا انھیں زبردستی اس کا انجکشن دیا گیا۔ جونز اور اس کی محبوبہ اپنے تمام مریدوں کو اس طرح مرتے ہوئے دیکھتے رہے اور بعد میں انھوں نے بھی خودکشی کر لی۔ تھوڑے سے ہی لوگ جان بچا کر نکل بھاگنے میں کامیاب رہے۔ اس سے ایک دن پہلے کیلی فورنیا کے ممبر کانگریس، لیو جے ریان اور ان کے چار ساتھیوں کو کئی اخباری رپورٹروں کے ساتھ نزدیکی ہوائی اڈے پر گھات لگا کر گولیوں سے اڑا دیا گیا تھا جو ایک گھنے جنگل کے اندر اس فرقے کے اڈے اور جونز کے منصوبے کا پتہ لگنے کے بعد گھروں کو واپس جانے کی کوشش کر رہے تھے۔

20 نومبر: 1955 کو پالی امریگر نے ہندوستان کی طرف سے پہلی ٹیسٹ ڈبل سینچری بنائی۔ نیوزی لینڈ کے خلاف ان کا اسکور 223 رن تھا۔ 1917 میں برطانوی جنرل ڈگلس ہیگ نے پہلی بار جنگ میں ٹینکوں کا استعمال کیا۔ اس نے پہلی عالمی جنگ میں جرمنی کے خلاف 300 ٹینکوں سے چڑھائی کی۔ 1889 کو امریکی ماہر فلکیات ایڈون ہبل کی پیدائش ہوئی جنھوں نے پہلی بار بتایا کہ کائنات لگاتار پھیل رہی ہے۔ دنیا کی سب سے بڑی خلائی دوربین کا نام ان ہی کے نام پر ہبل ٹیلی اسکوپ رکھا گیا تھا جو کائنات میں بہت دور تک دیکھ سکتی ہے۔ امریکہ کے مقتول صدر جان کینیڈی کے چھوٹے بھائی رابرٹ کینیڈی 1925 میں پیدا ہوئے۔ اپنے بھائی کے قتل کے بعد وہ امریکہ کے صدر بننے کی دوڑ میں سب سے آگے تھے مگر انھیں بھی 1968 میں قتل کر دیا گیا۔

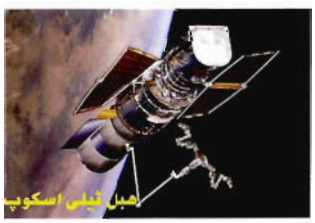

21 نومبر: 1783 کو پیرس میں ژیاں فرانسواں پلاترے دی روزیئر اور مارکوئی فرانسواں لارین دی آرلینڈ نے پہلی بار ایک ہاٹ ایئر غبارے میں اڑان بھری اور 300 فٹ کی اونچائی پر 25 منٹ تک 6 میل کا سفر کیا۔ تماشائیوں میں امریکہ کے بنجامن فرینکلن بھی تھے۔ فرانسیسی مصنف اور فلسفی والٹیئر 1694 میں پیرس میں پیدا ہوئے۔

22 نومبر: ہندوستان کے علاقوں پر قبضہ کرنے والے پہلے انگریز افسر رابرٹ کلائیو کی 1773 میں 48 سال کی عمر میں موت ہوئی۔ 1497 کو پرتگالی جہاز راں واسکوڈی گاما نے ہندوستان پہنچنے کا سمندری راستہ ڈھونڈتے ہوئے براعظم افریقہ کے جنوب میں کیپ آف گڈ ہوپ کا چکّر لگایا۔ 1963 میں امریکی شہر ڈلاس کی ایلم

اسٹریٹ پر امریکہ کے 35ویں صدر جان ایف کینیڈی کو اس وقت قتل کر دیا گیا جب وہ ایک کھلی کار میں گزر رہے تھے۔ قاتل نے ان پر ایک اونچی عمارت سے گولی چلائی تھی۔ 1939 سے اسپین پر حکومت کرنے والے ڈکٹیٹر جنرل فرانسسکو فرانکو کی موت کے بعد جوان کارلوس کو 1975 میں اسپین کا بادشاہ بنایا گیا۔ فرانس کو جرمنی سے نجات دلانے والے فرانس کے صدر چارلس ڈی گال 1890 میں پیدا ہوئے۔

24 نومبر: 1859 کو برطانیہ کے مشہور سائنسی مفکر چارلس ڈارون کی کتاب On the Origin of Species by Means of Natural Selection شائع ہوئی جس میں پہلی بار یہ نظریہ سامنے رکھا گیا کہ تمام جان دار بنیادی طور پر کسی ایک جان دار سے پیدا ہوئے ہیں۔ 1874 میں امریکہ کے جوزف گلیڈن نے کانٹے دار تار کی اپنی ایجاد کا پیٹنٹ کرایا۔ لوگوں کے برتاؤ اور عادتوں میں سدھار پر لیکچر دینے اور کتابیں لکھنے کے لیے مشہور ڈیل کارنیگی 1888 میں میری ولے مسوری میں پیدا ہوئے۔

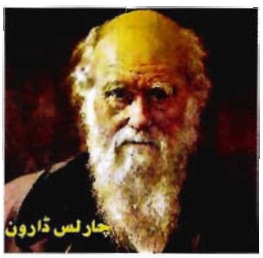
چارلس ڈارون

25 نومبر: 1839 کو آندھرا پردیش کے ساحلی شہر کورنگا سے ایک زبردست سائیکلون آ ٹکرایا۔ اس طوفان کی 40 فٹ اونچی لہروں نے 25 ہزار جہاز اور کشتیاں تباہ کر دیں اور 3 لاکھ لوگ اس میں مارے گئے۔ یہ شہر اس بری طرح تباہ ہوا کہ دوبارہ کبھی نہیں بسایا جا سکا۔

26 نومبر: 1949 کو ہندوستان نے ایک جمہوری آئین (کانسٹی ٹیوشن) اپنایا۔ 2008 میں دہشت گردوں نے ممبئی پر حملہ کیا۔ پاکستان کے دہشت گردوں نے ایک ساتھ کئی منظم حملے کئے اور 164 لوگوں کو ہلاک اور 250 سے زیادہ لوگوں کو زخمی کر دیا۔ ممبئی کے تاج ہوٹل میں ایک دہشت گرد ٹکڑی دو روز تک قتل و غارت کرتی رہی۔ ملک میں دودھ کا انقلاب لانے والے انجینئر ورگیز کورئین 1921 میں پیدا ہوئے۔

1703 میں جنوبی انگلینڈ میں زبردست طوفان آیا جس کی تباہ کاری دو دن جاری رہی اور اس میں ٹیمز اور سیورن کی ندیوں میں باڑھ آ گئی کل ملا کر 8 ہزار لوگوں کی موت ہوئی۔ مصر میں ہاورڈ کارٹر اور لارڈ کرناروون Lord Carnarvon 1922 میں پہلی بار شاہ توتن خامن کے مقبرے میں داخل ہوئے۔

اینڈرز سیلسیس

27 نومبر: یوروپ میں عام طور پر حرارت ناپنے کے لیے استعمال ہونے والے پیمانے سینٹی گریڈ ٹمپریچر اسکیل کے موجد اینڈرز سیلسیس 1701 میں سویڈن میں پیدا ہوئے۔ ان ہی کے احترام میں اب سینٹی گریڈ کو سیلسیس کہا جاتا ہے۔

28 نومبر: 1945 کو آسٹریلیا سروسز نے کلکتہ میں دوسرا کرکٹ ٹیسٹ جیتا۔ مشہور برٹش آرٹسٹ اور شاعر ولیم بلیک 1757 میں لندن میں پیدا ہوئے۔ Songs of Innocence اور Songs of Experience ان کے مشہور شاہکار ہیں۔ جرمن سوشلسٹ مفکر فریڈرک اینجلز 1820 میں پیدا ہوئے۔ وہ کمیونسٹ نظریہ کے بانی کارل مارکس کے قریبی دوست تھے۔

29 نومبر: 1989 کو راجیو گاندھی نے وزیر اعظم کے عہدے سے استعفیٰ دے دیا۔ صنعت کار جے آر ڈی ٹاٹا کا 1993 میں انتقال ہوا۔ 1929 میں امریکی مہم جو، رچرڈ بائرڈ اور برنٹ بالچن نے پہلی بار ہوائی جہاز سے قطب جنوبی کا سفر کیا۔ 1947 میں اقوام متحدہ نے فلسطین کو یہودیوں اور عربوں کے دو حصوں میں تقسیم کر دیا جس کی بنیاد پر اگلے سال یہودیوں کا ملک اسرائیل وجود میں آیا۔ 1989 میں چیکوسلوواکیہ میں 41 سال سے چلی آ رہی کمیونسٹ حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔

30 نومبر: 1835 کو مشہور امریکی مصنف مارک ٹوین فلوریڈا میں پیدا ہوئے۔ یہ ان کا قلمی نام تھا۔ اصلی نام تھا سیموئل کلیمنس۔ دی ایڈونچر آف ہکل بری فن اور دی پرنس اینڈ پاپر، اُن کی مشہور ترین کتابیں ہیں۔ دوسری عالمی جنگ کے مشہور برطانوی وزیر اعظم ونسٹن چرچل 1874 میں آکسفورڈ شائر انگلینڈ میں پیدا ہوئے۔ □

جگن ناتھ آزاد

چالیس دینار اور سچ!

سیکڑوں سال پہلے کی بات ہے، ملک عراق کے ایک چھوٹے سے شہر جیلان میں ایک لڑکا رہتا تھا۔ اس کا باپ مر چکا تھا۔ صرف ماں تھی۔ وہ بڑی نیک اور عقل مند عورت تھی۔ اس نے پہلے تو لڑکے کو خود تعلیم دی، اور پھر ایک مدرسے میں پڑھنے کو بٹھا دیا۔ مدرسے کی تعلیم ختم ہونے پر ماں نے دیکھا کہ لڑکے کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا شوق ہے تو اس نے اسے بغداد بھیجنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس زمانے میں بغداد کا

شہر تعلیم کے لیے دنیا بھر میں مشہور تھا۔

مگر لڑکے کو بغداد بھیجنا آسان بات نہ تھی۔ ان دنوں سفر کرنا بڑا مشکل تھا۔ ریل اور موٹر تو بڑی بات ہے، گھوڑا گاڑیاں تک نہ تھیں۔ لوگ گھوڑوں اور اونٹوں پر سفر کرتے تھے۔ مگر جگہ جگہ ڈاکوؤں کے گروہ موجود تھے جو مسافروں کو لوٹ لیا کرتے تھے۔ اس لیے لوگ اکیلے سفر کرنے کی بجائے قافلوں کی شکل میں سفر پر نکلا کرتے۔

اتفاق سے انہی دنوں ایک قافلہ بغداد جا رہا تھا۔ ماں نے اپنے لڑکے کو اس قافلے کے ساتھ کر دیا اور چلتے وقت اسے نصیحت کی ''بیٹا خوب پڑھنا اور ہمیشہ ہر حال میں سچ بولنا۔''

لڑکے نے اپنی ماں کی نصیحت پر عمل کرنے کا وعدہ کیا اور پھر اس کی دعائیں لے کے قافلے کے ساتھ بغداد کی طرف روانہ ہو گیا۔

یہ قافلہ ابھی بغداد کے راستے ہی میں تھا کہ ایک جگہ ڈاکوؤں نے حملہ کر دیا اور قافلے والوں کا مال اسباب لوٹنے لگے۔ ڈاکو لوگوں کو مارتے پیٹتے اور لوٹتے ہوئے اِدھر سے اُدھر بھاگ رہے تھے۔ ایسی حالت میں وہ لڑکا جس کی عمر صرف بارہ سال تھی، چپ چاپ ایک طرف کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر نہ کوئی گھبراہٹ تھی اور نہ پریشانی۔

اتنے میں ایک ڈاکو پاس آیا اور اس سے پوچھنے لگا۔

''لڑکے تیرے پاس بھی کچھ ہے؟'' لڑکے نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔ ''ہاں چالیس دینار ہیں۔''

ڈاکو نے اسے مذاق سمجھا۔ وہ سوچنے لگا کہ بھلا اتنے سے لڑکے کے پاس چالیس دینار کہاں ہو سکتے ہیں؟ وہ ہنستا ہوا چلا گیا۔

کچھ دیر بعد ایک اور ڈاکو لڑکے کے پاس سے گزرا۔ اس نے بھی لڑکے سے وہی سوال کیا اور لڑکے نے پھر وہی جواب دیا۔ پہلے ڈاکو کی طرح اس کو بھی اس بات کا یقین نہ آیا اور وہ اسے مذاق سمجھ کر ہنستا ہوا چلا گیا۔ اس کے بعد ایک اور ڈاکو آیا۔ اس کے ساتھ بھی یہی گفتگو ہوئی۔ وہ اسے پکڑ کر اپنے سردار کے پاس لے گیا اور کہنے لگا۔

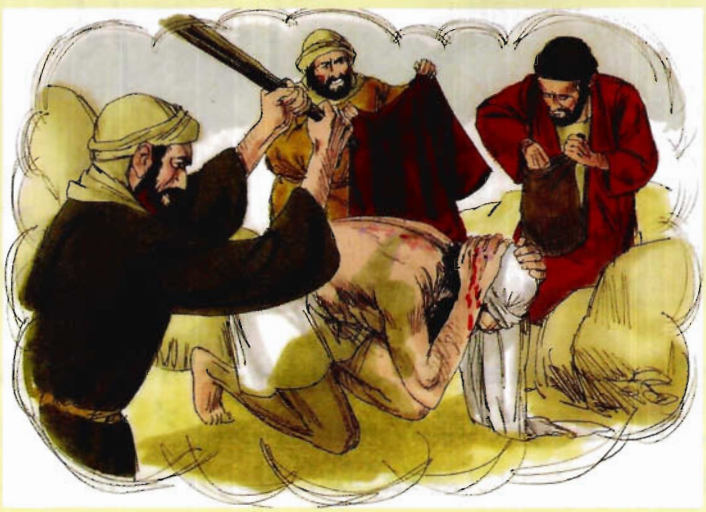

''سردار یہ لڑکا کہتا ہے کہ میرے پاس چالیس دینار ہیں۔ لیکن اس کی شکل سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں۔''

سردار نے حیرانی سے لڑکے کی طرف دیکھا اور اس سے پوچھا۔

''کیا واقعی تمھارے پاس چالیس دینار ہیں؟''

لڑکے نے جواب دیا ''جی ہاں!''

قدیم بغداد

سردار نے پوچھا، ''کہاں ہیں؟''

لڑکا بولا ''میرے کرتے کے اندر سلے ہوئے ہیں۔''

سردار نے لڑکے کا کرتا ادھڑوا کر دیکھا تو اس میں سچ مچ چالیس دینار نکلے۔ وہ اور زیادہ حیران ہوا اور کہنے لگا۔ ''لڑکے، کیا تجھے معلوم نہیں ہم ڈاکو ہیں اور لوگوں کو لوٹنا ہمارا کام ہے؟''

لڑکے نے جواب دیا ''میں جانتا ہوں۔''

اس پر سردار نے نرمی سے کہا ''پھر تم نے یہ دینار چھپانے کی کوشش کیوں نہیں کی؟ اگر تم اپنی زبان سے نہ کہتے تو ہمیں خیال بھی نہیں ہوسکتا تھا کہ تمھارے پاس چالیس دینار ہیں۔''

اس پر لڑکے نے جواب دیا ''میں تعلیم حاصل کرنے جارہا ہوں یہ چالیس دینار میری والدہ نے حفاظت کے خیال سے میرے کرتے کے اندر سی دیے تھے تاکہ کسی کو پتہ نہ چلے۔ مگر رخصت ہوتے ہوئے انھوں نے مجھے نصیحت کی تھی کہ بیٹا، ہر حال میں سچ بولنا۔ ماں کی نصیحت مجھے ان چالیس دیناروں سے زیادہ عزیز ہے۔''

ہر طرف سناٹا چھا گیا۔ سردار کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ لڑکے کے سچ بولنے کا سردار کے دل پر بڑا گہرا اثر ہوا۔ وہ اپنے آپ سے کہنے لگا۔

''افسوس، تجھ سے تو یہ لڑکا ہی ہزار درجے اچھا ہے، جس نے اس حالت میں بھی ماں کی نصیحت کو یاد رکھا اور سچ سے منھ نہ موڑا۔ اور ایک تو ہے کہ اچھے کاموں سے منھ موڑ کر برے کاموں میں پھنسا ہوا ہے۔''

سردار نے اسی وقت اپنے ساتھیوں کو حکم دیا کہ قافلے والوں کا تمام مال واپس کردیں۔ پھر اس نے سچے دل سے عہد کیا کہ اب وہ کبھی خدا کی مخلوق کو دکھ نہیں دے گا اور ہمیشہ نیک کام کرے گا۔

اس طرح اس لڑکے کے سچ بولنے کی وجہ سے ایک ڈاکو ہمیشہ کے لیے نیک آدمی بن گیا۔ یہی وہ لڑکا ہے جسے دنیا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے نام سے جانتی ہے۔ آپ اللہ کے بہت بڑے ولی اور غریبوں کی مدد کرنے والے بزرگ تھے۔ آپ نے تمام زندگی اسلام کی خدمت کی اور لوگوں کو اللہ اور اس کے رسولؐ کا سیدھا اور سچا راستہ دکھایا۔ □

شکیل بدایونی

انسان تھا پہلے بندر

کہتے تھے استاد ہمارے نام تھا جن کا مچھندر
انسان تھا پہلے بندر
لمبی دم والے تھے سارے اپنی قوم کے اندر
انسان تھا پہلے بندر
نہ کوئی جون تھا نہ کوئی عبدل نہ کوئی تھا گوپال
سب کی صورت اک جیسی تھی ایک تھی سب کی چال
ننگے پھرتے تھے جنگل میں بن کے مست قلندر
انسان تھا پہلے بندر

کام کیا یہ پہلا ہم نے بن گئے جب انسان
مٹّی کے دو چار گھروں میں بانٹ دیے بھگوان
کسی نے کھولا اونچا گرجا کسی نے مسجد مندر
انسان تھا پہلے بندر
بھول گئے سب اک دوجے کو بن کر آدم زاد
کیسے کیسے جال میں پھنس گئی بندر کی اولاد
کوئی بنا ہے آج بھکاری کوئی آج سکندر
انسان تھا پہلے بندر
لمبی دم والے تھے سارے اپنی قوم کے اندر
انسان تھا پہلے بندر

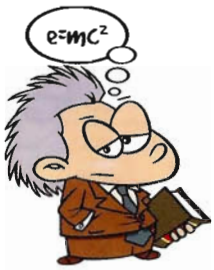

آپ کے سوال

ڈاکٹر بقراط کے جواب

ڈاکٹر بقراط عجیب شخصیت کے مالک ہیں۔کوئی ایسا سوال نہیں جس کا جواب ان کے پاس نہ ہو۔مشکل بس یہ ہے کہ ان کے دماغ کی زنبیل میں جواب تو بہت سے ہیں، لیکن سوالوں سے ان کا ذہن خالی ہوگیا ہے۔ بچوں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان کے پاس پوچھنے کے لیے ہمیشہ بہت سے سوال رہتے ہیں۔ یہ کیا ہے، وہ کیوں ہے، یہ کیوں نہیں ہے، وہ کس لیے ہے، کس کے لیے ہے...یہ ایسے سوال ہیں جن کا جواب ملنے سے نئے سوال سامنے آتے ہیں، اور یوں سوالوں کے ساتھ ساتھ آپ کے علم و معلومات میں اضافے کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر بقراط آپ کے سوالوں کا بے صبری سے انتظار کررہے ہیں۔ان سے بات کریں گے میاں افلاطون جو ایک مشہور طالب علم ہیں اور ایک ہی کلاس میں لگاتار فیل ہونے کا عالمی ریکارڈ بنانے والے ہیں!

میاں افلاطون: آداب ڈاکٹر صاحب۔آج سب سے پہلے آپ سے میں ایک ایسا سوال پوچھنے جارہا ہوں جس کا جواب آپ کیا دنیا میں کوئی شخص نہیں دے سکتا۔

ڈاکٹر بقراط: اچھا!؟ وہ کیا سوال ہے۔

افلاطون: دیکھیے سوال سن کر میری پٹائی مت کر دیجیے گا۔ کیونکہ یہ ایسا سوال ہے جسے سن کر اچھے اچھوں کو غصہ آسکتا ہے۔

ڈاکٹر بقراط: اماں تم پوچھو تو سہی۔سوال پوچھنے کے لیے علم اور عقل کی ضرورت ہوتی ہے۔جاہل آدمی کبھی کوئی سوال نہیں کرتا۔ ذرا میں بھی دیکھوں تم میں اتنی عقل ہے یا نہیں۔

افلاطون: ٹھیک ہے ٹھیک ہے...اگر میں آپ سے پوچھوں کہ کیا آپ کو پاگل پن کے دورے پڑنا بند ہوگئے ہیں تو ہاں یا نہیں میں آپ کا کیا جواب ہوگا۔

ڈاکٹر بقراط: کچھ بھی نہیں۔میرا جواب ذرا عملی شکل میں ہوگا۔میں تمھیں پیار سے گلے لگاؤں گا کہ تم نے سچ مچ ایک مشکل سوال کیا ہے اور تم روز بروز ذہین ہوتے جارہے ہو، پھر میں تمھارے کان ناک گلے اور پاؤں پر نمک مرچ چھڑک کر اپنے ڈاگی کے کمرے میں لے جاؤں گا اور جب وہ تمھارا گلا دبوچ کر اپنے لنچ کا پہلا لقمہ بنائے گا تو میرا خیال ہے اس کے گلے سے اترتے ہوئے تمھیں یقیناً پتہ چل جائے گا کہ میرا جواب ہاں میں ہے یا نہیں میں!

افلاطون: (پسینہ پونچھتے ہوئے) اوفوہ بڑا ہی خوف ناک جواب تھا۔ خیر اب غصہ تھوک دیجیے، مراداباد سے تسلیم خان پوچھتے ہیں، پاگل پن کیا چیز ہے اور یہ کیوں ہوتا ہے؟

ڈاکٹر بقراط: ہاں! یہ ہے واقعی مشکل اور ڈھنگ کا سوال۔ جواب اس کا طویل ہوسکتا ہے مگر میں مختصر طور پر سمجھانے کی کوشش کروں گا۔عام طور پر انسان کے ہر اس رویّے کو پاگل پن کہہ دیا جاتا ہے، جو عام لوگوں سے الگ ہو۔ جب کہ ایسا نہیں ہے۔ گیلیلیو اور کوپرنکس نے جب کہا کہ زمین گول ہے اور سورج کے چاروں طرف گھومتی ہے تو انھیں بھی پاگل کہا گیا تھا۔ پیغمبروں کی غیر معمولی علم کی باتوں کو بھی ان کے دشمنوں نے پاگل پن کہا، لیکن زمانہ آج ان کو عقیدت کی نظر سے دیکھتا ہے۔تسلیم خان کی مراد غالباً اس پاگل پن سے

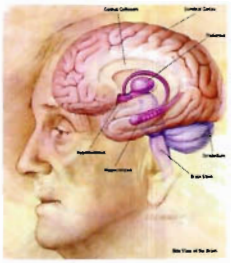

ہے جو دماغی بیماریوں کی وجہ سے ہوتا ہے۔ کسی کا دماغ پیدائشی طور پر کمزور ہوتا ہے اور وہ جسم کے باقی حصوں کی طرح بڑا نہیں ہوتا۔ چنانچہ ایسے معذور شخص کو بھی پاگل کہہ دیا جاتا ہے۔ اس سب کو سمجھنے کے لیے دماغ کی بناوٹ کو جاننا ضروری ہے، جس کے بارے میں تم بڑی کلاسوں میں پڑھو گے اور جانو گے کہ دماغ کا ایک حصہ ہمارے جسم کے حصوں کو کس طرح کنٹرول کرتا ہے، مثلاً دل کو دھڑکا کر خون کو پورے جسم میں پھیلاتا ہے، پھیپھڑوں سے سانس دلاتا ہے، ہاتھ پاؤں چلاتا ہے، زبان کو بولنے کے لیے ہلاتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ ایک حصہ کان ناک آنکھ وغیرہ سے سننے، دیکھنے اور سونگھنے میں آنے والی باتوں کو سمجھتا اور ان سے سیکھتا ہے۔ زبان، رنگ، شکل وغیرہ کی سمجھ اسی طرح آتی ہے۔ ایک اور حصہ کمپیوٹر کی طرح معلومات کو اپنے اندر جمع کرتا جاتا ہے۔ ان سبھی حصوں میں تال میل اور ربط ہوتا ہے اور یہ سب مل کر ہمیں تندرست اور زندہ رکھتے ہیں۔ اگر اس تال میل میں کسی چوٹ، حادثے، صدمے، یا کمزوری کی وجہ سے رکاوٹ یا خلل پیدا ہوجائے تو آدمی کی حرکتوں میں عجیب وغریب تبدیلیاں آجاتی ہیں جنھیں ہم پاگل پن کہہ دیتے ہیں۔ کئی وہم پرست لوگ اسے اوپری ہواؤں، جنات اور بھوت پریت کا اثر سمجھ کر جھاڑ پھونک، تنتر منتر اور تعویذ گنڈوں کے ذریعے مریض کو ٹھیک کرانے کے لیے جھوٹے باباؤں، اوجھاؤں اور لالچی مولویوں کے چکر میں پڑ جاتے ہیں۔ یہ لوگ مریض کو جس طرح کی تکلیفیں پہنچاتے ہیں ان کے بارے میں سن کر ہی رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ ایسے مریضوں کا علاج قابل ڈاکٹروں، حکیموں اور ویدوں اور نفسیات کے ماہروں سے کرانا چاہیے جو مرض کی نوعیت کو سمجھ کر صحیح علاج تجویز کرتے ہیں۔ جنون اور دیوانگی کو پاگل پن میں شمار کر

لیا جاتا ہے لیکن یہ دماغی کیفیات فائدہ مند بھی ہوتی ہیں۔ مثلاً اگر تمھیں پڑھنے لکھنے کا جنون ہو جائے اور بڑا آدمی بننے کا دیوانہ پن سوار ہوجائے تو تم بڑے فائدے میں رہو گے۔

افلاطون: مشورے کے لیے شکریہ۔ ذاکر نگر نئی دہلی سے شفیعہ بانو پوچھتی ہیں اسٹیریوفونک ساؤنڈ کیا چیز ہے۔

ڈاکٹر بقراط: یہ تو بڑا آسان سوال ہے بلکہ مجھے حیرت ہے کہ کوئی آج بھی یہ سوال پوچھ سکتا ہے۔ خیر کوئی بات نہیں بانو، یہ تو آپ جانتی ہی ہوں گی ہر انسان کے دو کان ہوتے ہیں جس سے پتہ چل جاتا ہے کہ کوئی آواز کس طرف سے آرہی ہے۔ دائیں سے یا بائیں سے۔ بعض جانور اپنے کان گھما کر آواز کی سمت کا پتہ لگاتے ہیں۔ لاکھوں برس پہلے انسان بھی کان گھما کر سنا کرتا تھا جس کا ثبوت یہ ہے کہ کان کو ہلانے والی رگیں مردہ ہوجانے کے باوجود ابھی تک انسان کے جسم میں چلی آرہی ہیں۔

افلاطون: یہ تو بڑے کام کی رگیں ہیں۔ مردہ کیسے ہوگئیں۔

ڈاکٹر بقراط: آدمی کی گردن زیادہ لچیلی ہوتی ہے اس لیے وہ کان کی بجائے سر کو گھمانے کا زیادہ عادی ہے شاید اسی لیے کان گھمانے کی ضرورت نہ رہی اور اس کی رگیں کمزور ہوتے مردہ ہوگئیں۔ دراصل جسم کے جس حصے کی کسی جاندار کو ضرورت نہ رہے قدرت اسے ختم کرنے لگتی ہے۔ مگر خیر یہ الگ موضوع ہے۔ اس لیے کان پر واپس آتے ہیں۔ جب ٹیلی فون، گراموفون اور ریڈیو کی ایجاد ہوئی تو ہمارے کان ان سے نکلنے والی ہر آواز کو ایک ہی اسپیکر سے سنتے تھے اور سب آوازیں ایک ہی سمت سے آتی سنائی دیتی تھیں۔ ریڈیو پر کوئی ڈرامہ نشر ہوتا تو ہر کردار کی آواز ایک ہی جگہ سے آتی ہوئی لگتی۔ صرف دور اور نزدیک کی آوازوں کا فرق سمجھ میں آپاتا تھا۔ لیکن دائیں بائیں

کا پتہ نہیں چلتا تھا۔ گانے میں طبلہ ڈھولک کس طرف ہے ستار سارنگی کس جانب یہ معلوم ہی نہیں ہوتا تھا۔ چنانچہ آوازوں کی سمتوں کا احساس کرانے کے لیے دو کانوں کے لیے دو مائکروفون اور ان کے لیے دو اسپیکر لگانے کا خیال پیدا ہوا۔ اس کے لیے دوہرا ٹرانسمیشن بھی ضروری تھا۔ لیکن پرانے زمانے کے ریڈیو بینڈ، میڈیم اور شارٹ ویو پر یہ ممکن نہیں تھا۔ البتہ گراموفون ریکارڈ پر یہ ممکن تھا کہ ایک طرف کی آواز اونچے

نیچے گڈھوں میں اور دوسری طرف کی آوازیں دائیں بائیں بل کھاتے لہریوں کی شکل میں ریکارڈ کی جائے۔ یہ تجربہ کامیاب رہا اور یوں اسٹیریوفونک ساؤنڈ کا جنم ہوا جس میں بولنے والا اگر دائیں طرف ہے تو اس کی آواز ایمپلی فائر کے دائیں اسپیکر سے آتی تھی اور بائیں طرف ہے تو بائیں اسپیکر سے۔ یہ سن کر کان اسی طرح دائیں بائیں کی آوازیں سننے لگے جیسی عام زندگی میں سنتے ہیں۔ جب ریڈیو پر فریکوئنسی موڈیولیشن یعنی ایف ایم کی شروعات ہوئی تو ریڈیو پر بھی اسٹیریو ساؤنڈ آنے لگی۔ اور اب تو موبائل ہینڈسیٹ، آئی پیڈ، ڈی وی ڈی وغیرہ میں یہ عام ہے۔ بلکہ ہوم تھیٹر میں تو آوازوں کی سمتوں میں اور اضافہ ہوگیا ہے۔ دائیں بائیں کے ساتھ بیچ کی اور آگے پیچھے کی آوازیں بھی سنائی دیتی ہیں جو اسی حساب سے ریکارڈ بھی کی گئی ہوتی ہیں۔ ان میں کواڈرافونک اور سراؤنڈ ساؤنڈ شامل ہیں۔

افلاطون: اب ایک لذیذ سوال سنیے۔ فاطمہ جمال اورنگ آباد مہاراشٹر سے پوچھتی ہیں کہ تیل میں پوری تلنے سے پہلے پوری سنگل ہوتی ہے اور تلنے پر ڈبل ہوجاتی ہے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟

ڈاکٹر بقراط: مس فاطمہ کا مطلب غالباً یہ ہے کہ میدے یا آٹے کے ایک پیڑے سے بننے والی پوری کی دو تہیں کیسے بن جاتی ہیں۔ بی بی اس بھید کو سمجھنا ذرا بھی مشکل نہیں ہے۔ دراصل جیسے ہی کھولتے ہوئے تیل میں اکہری پوری ڈالی جاتی ہے تو پوری کا پانی بھاپ بننے لگتا ہے لیکن چاروں طرف کھولتا تیل موجود ہونے کی وجہ سے یہ بھاپ پوری کے اندرونی حصے میں پھیلنے لگتی ہے اور اسے پھلا دیتی۔ یوں پوری دوہری ہوجاتی ہے۔

افلاطون: اب ایک آخری سوال! میرا روڈ ممبئی سے رؤف بلال لکھتے ہیں کہ میں نے سنا ہے سمندر میں بھی پہاڑ ہوتے ہیں۔ کیا یہ صحیح ہے؟

ڈاکٹر بقراط: آپ نے ٹھیک سنا ہے بلال میاں۔ سمندروں میں ایک دو نہیں بلکہ ایک اندازے کے مطابق پورے ایک لاکھ پہاڑ ہیں۔ سمندروں میں پائے جانے والے بہت سے جزیرے بھی دراصل

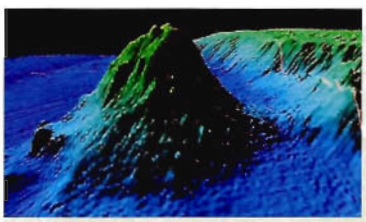

پہاڑ ہی ہیں جو سمندر کی تہہ سے سطح سمندر کے اوپر تک اٹھے ہوئے ہیں۔ انہیں Seamount یا سمندری پہاڑ بھی کہتے ہیں۔ یہی نہیں سمندر میں آتش فشاں یا جوالا مکھی پہاڑ بھی ہیں۔ ان میں کئی تو 12 سے 15 ہزار فٹ تک اونچے ہیں اور اس کے باوجود ان کی چوٹیاں سمندر کی سطح سے ہزاروں فٹ اندر چھپی ہوئی ہیں۔

افلاطون: واہ ڈاکٹر صاحب۔ آپ کے جواب سے ایک بات میری سمجھ میں بھی آئی ہے۔

ڈاکٹر بقراط: اچھا، واقعی! کچھ باتیں تمھاری سمجھ میں بھی آجاتی ہیں۔

افلاطون: میری سمجھ میں یہ آیا ہے کہ زمینی پہاڑ کی چوٹی تک پہنچنا جتنا مشکل ہے سمندر پہاڑ کی چوٹی سر کرنا اتنا ہی آسان ہے۔ بس آپ کو تیرنا آنا چاہیے۔ میرا خیال ہے آج اتنا کافی ہے۔ خدا حافظ! □

فلم کاروں سے اہم گزارش

• بچّوں کی دنیا کے لیے کچھ بھی لکھتے وقت سادہ زبان اور آسان ترین لفظوں کا استعمال فرمائیں۔ • انگریزی لفظوں کو انگریزی میں بھی صاف صاف لکھیں۔ • بے وزن و بے بحر شعری تخلیقات نہ بھیجیں • کسی بھی موضوع پر لکھنے سے پہلے شعبہ ادارت سے ضرور مشورہ کر لیں • ہاتھ سے لکھے مضامین صرف اے فور A4 سائز کے کاغذ پر بھیجیں۔

قسط وار ناول

□ جولزورنے • مترجم: صفدر حسین

6 اَسّی دِن کا سفر

فرانسیسی مصنف ، شاعراور ڈرامہ نویس جولز گیبرئیل ورنے Jules Gabriel Verne دنیا میں‌سب سے زیادہ پڑھے جانے والے ناول نگاروں میں شامل ھیں۔ جاسوسی ناول نگار اگاتھا کرسٹی کے بعد جولز ورنے دنیا کے دوسرے مصنف ھیں جن کی کتابوں کا سب سے زیادہ زبانوں میں ترجمه ھوا ھے۔ ان کے ناولوں پر فلمیں بن چکی ھیں جن میں اراؤنڈ دی ورلڈ ان ایٹی ڈیزAround the World in Eighty Day بهت مشهور هوئی۔ یه ایک ایسے شریف انسان فلیس فوگ Phileas Fogg کی مهم جوئی کا قصه ھے جو لندن کے ایک کلب میں تقریباً ڈیڑھ سو سال پهلے کے ایک ایسے زمانے میں صرف اسّی دن کے اندر دنیا کا پورا ایک چکّر لگانے کی شرط قبول کر لیتا ھے جب ھوائی جهاز اور موٹریں نهیں تھیں اور پانی کے جهاز بھاپ سے چلتے تھے۔ جیسے ھی فلیس فوگ اپنے فرانسیسی خادم ژاں پاسپرٹوJean Passepartout کو ساتھ لے کر شرط کے مطابق اپنا سفر شروع کرتا ھے پولیس اسے ڈاکو سمجھ کر پیچھے لگ جاتی ھے اور یوں طرح طرح کی رکاوٹوں سے بھرا اس کا سفر بالآخر مکمل ھوتا ھے تو پته چلتا ھے که وقت کے معاملے میں پهلی مرتبه فلیس فوگ سے ایک غلطی ھوگئی ھے اور وہ بظاھر شرط ھار جاتا ھے۔ لیکن تبھی ایک حیرت انگیز سچّائی سامنے آتی ھے جسے جان کر آپ حیران رہ جائیں گے که ارے! یه تو هم نے سوچاھی نهیں تھا! مدیر

اب تک کی کہانی: یہ کہانی 1872 کی ہے۔لندن میں ایک مالدار شخص فلیس فوگ رہتا تھا۔لوگ بس اتنا جانتے تھے کہ وہ وقت، ضابطوں اور قول کا سخت پابند شریف آدمی ہے جوایک بڑے گھر میں تنہا رہتا تھاجہاں اس کے اکیلے ملازم کوسارے کام مشین کی طرح قاعدے سے کرنے پڑتے تھے۔ 2اکتوبر کو بے چارے نوکر کی شامت آئی تو اس نے مالک کوشیو کے لیے86ڈگری کی بجائے 84ڈگری کا گرم پانی لاکردے دیا۔فوگ نے اسے نکال کرایک فرانسیسی شخص ژاں پاسپرٹو کو ملازم رکھ لیاجو ایماندار اوروقت کا پابند تھا۔ اسی روز فوگ اپنے 'ریفارم کلب' پہنچا تو اس کے دوست تین روز پہلے 29 ستمبر کو بنک آف انگلینڈ میں بڑی ڈکیتی کے بارے میں بات کرنے لگے،جس میں ڈاکو 55ہزار پونڈ کے نوٹ لے اڑا تھا۔ان کا خیال تھا کہ ڈاکو نہ جانے کہاں ہوگا اور اتنی بڑی دنیا میں اسے ڈھونڈ پانا اب ممکن نہیں۔مگر فوگ کا کہنا تھا کہ انسان کی رفتار نے دنیا کو مختصر کر دیا ہے اور چور کو پکڑا جا سکتا ہے۔اس کا دعویٰ تھا کہ وہ اسّی روز میں پوری دنیا کا چکّر لگا سکتا ہے۔اس کے دوست

اسٹیوارٹ نے کہا وہ اس پر چار ہزار پونڈ کی شرط لگانے کو تیار ہے۔ دوسرے لوگ بھی شرط میں مل گئے۔ فوگ نے 20 ہزار پونڈ کی شرط قبول کر لی۔ شرط کے مطابق فوگ کو اسی روز 2 اکتوبر بدھ کو سفر پر روانہ ہونا تھا جس کے بعد 21 دسمبر سنیچر کی رات 8 بج کر 45 منٹ تک واپسی پر وہ شرط جیت سکتا تھا۔ فوگ اسی رات اپنے خادم پاسپرٹو کو ساتھ لے کر دنیا کے سفر پر نکل پڑا۔ ادھر لندن میں اس سفر کی دھوم مچ گئی۔ اخباروں میں فوگ کی تصویر بھی چھپی۔ شرط پر عام بحث ہونے لگی۔ کچھ لوگ فوگ کے حامی تھے تو کچھ خلاف۔ خفیہ پولیس کا جاسوس فکس ان کے پیچھے لگ گیا اور پاسپرٹو کو دوست بنا کر فوگ کی جاسوسی شروع کر دی، جو بروقت اپنے سفر پر آگے چل پڑا۔ سوئیز نہر سے یہ لوگ عدن اور پھر بمبئی پہنچے۔ وہاں سے کلکتہ جانے والی ٹرین پر سوار ہوئے تو الہ آباد سے پچاس میل پہلے انھیں ریلوے لائن نہ ہونے کی وجہ سے ٹرین چھوڑنی پڑی۔ فوگ کا نیا دوست سرفرانسس اور پاسپرٹو ہاتھی پر سوار ہو کر آگے روانہ ہوئے مگر راستے میں ایک عجیب واقعے نے انھیں روک لیا۔ ایک جوان بیوہ عورت کو جو بے ہوشی کے عالم میں تھی اس کے بوڑھے شوہر کی موت کے بعد جلانے کے لیے لے جایا جا رہا تھا۔ فوگ نے آگے بڑھنے سے پہلے اسے ستی ہونے سے بچانے کا فیصلہ کر لیا۔ اب آگے پڑھیے:

جان کی بازی

فلیس فوگ نے، اس عورت کو ستی ہونے سے بچانے کے جس خطرناک کام کا بیڑا اٹھایا تھا وہ بہ ظاہر ناممکن تھا۔ مگر اس نے فیصلہ کر لیا تھا اور وہ اپنا فیصلہ کبھی نہیں بدلتا تھا۔ سرفرانسس بھی فلیس فوگ کی اس مہم میں شریک ہو گیا۔ وفادار اور جاں نثار پاس پرٹو تو اپنے آقا کے ہر کام کے لئے جان تک کی بازی لگانے کے لئے تیار تھا۔

اس بارے میں مہاوت سے مشورہ کیا گیا تو اس نے کہا:

''تم مجھ پر بھروسہ کر سکتے ہو لیکن میں آگاہ کیے دیتا ہوں کہ اگر ہم پکڑے گئے تو نہ صرف ہمیں جسمانی تکلیف دی جائے گی بلکہ ہو سکتا ہے کہ ہمیں اپنی جان سے بھی ہاتھ دھونا پڑے۔''

فلیس فوگ نے پورے استقلال سے کہا ''یہ تو ہم جانتے ہیں۔

لیکن ہم نے پختہ ارادہ کر لیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں سورج ڈوبنے تک انتظار کرنا ہوگا۔ یہ کام رات ہی میں کیا جا سکتا ہے۔''

مہاوت بولا ''میرا بھی یہی خیال ہے۔''

پھر مہاوت نے اس بیوہ عورت کے متعلق جو کچھ سنا تھا بیان کرنے لگا۔ ''اس کا نام آؤدا ہے۔ وہ بمبئی کے ایک مالدار تاجر کی بیٹی ہے۔ کافی پڑھی لکھی اور خوب صورت۔ جب ماں مر گئی تو باپ نے بیٹی کی مرضی کے خلاف اس کی شادی بنڈیل کھنڈ کے بوڑھے مہاراجہ سے کر دی جو تین مہینے پہلے ہی مر گیا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ایک دفعہ اس نے محل سے بھاگ نکلنے کی بھی کوشش کی تھی لیکن پکڑی گئی۔ اس مرتبہ تو مہاراجہ کے رشتہ دار اسے جلا کر ہی دم لیں گے۔''

یہ دکھ بھری کہانی سن کر فلیس فوگ اور اس کے ساتھیوں کا ارادہ اور پکا ہو گیا۔ آخر کار سب نے یہ طے کیا کہ ہاتھی کو پلاجی مندر کے جتنا قریب ہو سکے لے جایا جائے۔ مہاوت اس مندر کے علاقہ سے اچھی طرح واقف تھا۔ وہ عورت اسی مندر میں بند رکھی گئی تھی۔ اب سوال یہ تھا کہ اس کو مندر سے کس طرح باہر لایا جائے؟ جب سب لوگ سو جائیں تو چپکے سے مندر میں داخل ہو کر اس عورت کو باہر نکالا جائے یا پھر مندر کی دیوار میں سوراخ بنا کر اسے غائب کر لیا جائے؟ یہ لوگ آخر وقت تک کسی نتیجہ پر نہ پہنچ سکے البتہ ایک بات پر سب ہی کو اتفاق تھا کہ صرف رات ہی میں اس عورت کو وہاں سے بچایا جا سکتا ہے۔

اندھیرا ہوتے ہی ہاتھی کو ایک درخت سے باندھ دیا گیا اور یہ چاروں کہنیوں اور گھٹنوں کے بل کھسکتے ہوئے مندر کی طرف بڑھ گئے۔ مندر کے سامنے مشعلیں جل رہی تھیں کچھ پہرہ داروں کے علاوہ سب لمبی تان کر سو رہے تھے۔ مندر سے کچھ فاصلے پر ندی کے کنارے صندل کی لکڑیوں کی چتا بنائی گئی تھی۔ اس پر مہاراجہ کی لاش رکھی ہوئی تھی جو سویرے جلائی جانے والی تھی۔

مندر کے قریب پہنچ کر سرفرانسس نے کہا ''ابھی تو مندر میں داخل ہونا ممکن نہیں ہے۔ کچھ دیر بعد پہرے دار بھی سو جائیں گے۔ تب ہی ہم اپنا کام کر سکیں گے۔''

پاسپرٹو بولا ''شاید وہ بھی تھک کر سو جائیں۔''

اسی خیال سے یہ چاروں ایک درخت کے نیچے لیٹ گئے اور انتظار کرنے لگے۔ وقت کاٹے نہیں کٹتا تھا۔ ایک ایک پل گزارنا دوبھر ہو گیا تھا۔ آدھی رات تک انتظار کرتے رہے، لیکن سپاہی ابھی تک مندر کے دروازے پر اسی طرح پہرہ دے رہے تھے۔ اب ایک ہی ترکیب تھی مندر کی پچھلی دیوار میں نقب لگایا جائے۔ تھوڑی دیر بعد چھپتے چھپاتے یہ لوگ مندر کے پیچھے پہنچ گئے۔ اس طرف کوئی پہرہ دار نہ تھا۔ مندر کی دیوار تک پہنچ جانا تو آسان تھا مگر اس میں سوراخ کرنا بہت مشکل تھا۔ فلیس فوگ اور اس کے ساتھیوں کے پاس چھوٹے سے چاقو کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ اتفاق سے مندر کی دیوار اینٹ اور لکڑی سے اس طرح بنی ہوئی تھی کہ اگر کسی طرح ایک اینٹ بھی نکالی جائے تو پھر باقی اینٹیں آسانی سے نکالی جا سکتی ہیں۔ مہاوت اور پاس پرٹو اینٹ نکالنے کی کوشش کرنے لگے تاکہ اس طرح کچھ اینٹیں نکال کر دو فٹ چوڑا سوراخ بنایا جا سکے۔ ابھی وہ اینٹیں نکالنے کی کوشش کر ہی رہے تھے کہ مندر کے اندر سے ایک آواز سنائی دی جس کے جواب میں باہر کے پہرہ داروں نے بھی آواز دی۔ پاسپرٹو اور مہاوت نے اپنا کام روک دیا۔ پھر چاروں چپکے سے اسی جگہ پر واپس چلے آئے جہاں وہ پہلے چھپے ہوئے تھے۔

کچھ دیر بعد انھیں یہ دیکھ کر بڑی مایوسی ہوئی کہ مندر کے پیچھے بھی کچھ سپاہی پہرہ دے رہے ہیں۔ سرفرانسس نے ناامیدی کے ساتھ کہا ''اب ہماری تمام کوششیں بے کار ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اب ہمیں واپس چلنا چاہئے۔''

مہاوت نے بھی کہا ''ہاں اب ہمیں واپس چلنا چاہئے۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔''

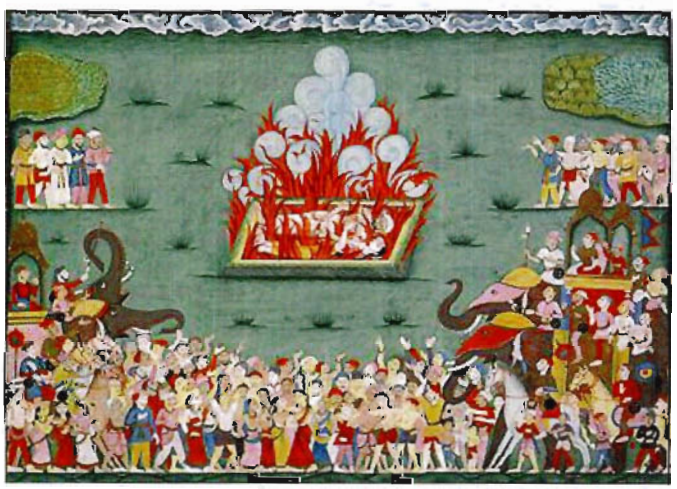

لیکن فلیس فوگ نے اطمینان سے کہا ''ٹھہرو مجھے الہ آباد کل دوپہر تک پہنچنا ہے۔''

''لیکن اب تم کیا کر سکتے ہو؟'' فرانسس نے پوچھا

''تھوڑی دیر میں دن نکل آئے گا اور پھر؟''

''ہو سکتا ہے کہ ہم آخری وقت میں کچھ کر سکیں۔'' فلیس فوگ نے جواب دیا۔

یہ سن کر سرفرانسس چکرا گیا اس کی سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ آخر یہ شخص کیا سوچ رہا ہے؟ کیا وہ عین اس وقت حملہ کر کے اس بیوہ کو بچانا چاہتا ہے جب اسے جلانے کے لئے لے جایا جا رہا ہو؟ لیکن وہ اتنا بے وقوف تو نہیں ہو سکتا۔ پھر بھی سرفرانسس نے آخری وقت تک فلیس فوگ کا ساتھ دینے کا تہیہ کر لیا، چاہے انجام کچھ ہی کیوں نہ ہو۔

سورج کی پہلی کرن آسمان پر نمودار ہو رہی تھی۔ ابھی جھٹپٹا سا تھا سارے لوگ جاگ اٹھے اور پھر گانا بجانا شروع ہو گیا۔ مندر کا دروازہ

کھول کر اس عورت کو باہر لایا گیا۔ سر فرانسس نے سراسیمگی کی حالت میں فلیس فوگ کا ہاتھ پکڑ لیا جس میں ایک کھلا ہوا چاقو تھا۔ جب جلوس آگے بڑھنے لگا تو فلیس فوگ اور اس کے ساتھی بھی جلوس میں اس طرح مل گئے کہ کسی کو خبر تک نہ ہوئی۔ جلوس آگے بڑھتا گیا۔ گانے بجانے کی آوازیں بلند ہوتی گئیں۔ جلوس چتا کے پاس پہنچ گیا تو اس دبلی پتلی بے ہوش بیوہ کو چتا پر مہاراجہ کی لاش کے بازو پر لٹا دیا گیا۔ فلیس فوگ اور اس کے ساتھی مجمع کے پیچھے چتا سے پچاس قدم کے فاصلے پر کھڑے تھے۔ جلتی ہوئی ایک مشعل چتا کی لکڑیوں میں لگائی گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے گہرے دھوئیں کے بادل چاروں طرف سے اٹھنے لگے۔ اس وقت فلیس فوگ چتا کی طرف بڑھنے والا ہی تھا کہ سر فرانسس اور مہاوت نے بڑھ کر اس کو پکڑ لیا لیکن وہ دونوں کو اپنے بازوؤں سے دھکیل کر پھر آگے بڑھنے لگا۔ اسی وقت مجمع میں سے کچھ چیخوں کی آواز سنائی دی اور لوگ ڈر کے مارے سجدے میں گر گئے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ مہاراج کا بے جان جسم آگ کے شعلوں سے اٹھ کھڑا ہوا اور عورت کو اپنے ہاتھ پر اٹھا کر دھوئیں کے بادلوں سے ہوتا ہوا، جلوس کے لوگوں اور سپاہیوں کے بیچ سے ہوتا ہوا صبح کے جھٹپٹے میں چلتا بنا۔

▲ اس ناول کو لندن میں ڈرامہ کے روپ میں بھی پیش کیا گیا ہے۔ اس منظر فلیس فوگ سر فرانسس اور پاسپرتو کو آؤ دا کی جان بچاتے ہوئے دکھایا گیا ہے

وہ شخص جو پھر سے زندہ ہو گیا تھا عورت کو اپنے ہاتھوں پر اٹھا کر تیزی سے فلیس فوگ کی طرف آیا اور کہا ''چلو بھاگ چلیں۔''

یہ پُراسرار شخص کوئی اور نہیں پاسپرٹو تھا جو ہر مشکل سے صاف بچ نکلتا تھا۔ دراصل رات میں پاس پرٹو سب کی نظریں بچا کر جھاڑ کی شاخوں پر سے ہوتا ہوا چتا تک پہنچ گیا تھا۔ وہ اندھیرے میں مہاراجہ کے مردہ جسم کے پاس لیٹ گیا اور اس کا قیمتی لباس اوپر سے اوڑھ لیا تاکہ کسی کو دکھائی نہ دے۔ جب چتا کی لکڑیوں کو آگ لگائی گئی اور دھوئیں کے بادل اٹھنے لگے تو وہ آؤدا کو لے کر فرار ہو گیا۔

آؤدا کو لے کر وہ جھاڑیوں تک پہنچ گئے اور تیز رفتار ہاتھی پر بیٹھ کر کچھ ہی دیر میں نظروں سے غائب ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد جب جلوس والوں کے ہوش ٹھکانے آئے اور انھیں اس چال کا پتہ چلا تو غصے میں انھوں نے فلیس فوگ اور اس کے ساتھیوں کا تعاقب کیا۔ لیکن کہاں ہاتھی کی دوڑ اور کہاں حضرت انسان۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہاتھی گولیوں اور تیروں کی زد سے بہت دور جا چکا تھا۔

اسی بھاگ دوڑ میں ہاتھی نے اپنی رفتار اور تیز کر دی تھی۔ جس کی وجہ سے وہ سب ٹھیک دس بجے الہ آباد پہنچ گئے۔ الہ آباد پہنچتے پہنچتے آؤدا کی طبیعت سنبھل گئی اور اب وہ بالکل ہوش میں آ چکی تھی۔ مہاوت نے سچ کہا تھا کہ آؤدا اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے۔ وہ انگریزی زبان بڑی روانی سے بول رہی تھی۔

الہ آباد چھوڑنے سے پہلے فلیس فوگ نے دریا دلی سے کام لیتے ہوئے ہاتھی مہاوت کو بخش دیا تو مہاوت بولا ''حضور تو مجھے ایک خزانہ دے رہے ہیں۔''

فلیس فوگ نے کہا ''تم اسے لے جاؤ مہاوت۔ پھر بھی تمہارا احسان مند رہوں گا۔''

پاسپرٹو بیچ میں ٹپک پڑا۔ ''یہ ہاتھی بہت اچھا اور بہادر جانور ہے۔''

''اسے لے جاؤ دوست۔ یہ تمہارا انعام ہے'' پھر وہ ہاتھی کے پاس گیا۔ اسے گڑ کے دو چار ڈلے کھلائے اور پیٹھ تھپکتے ہوئے کہا ''خدا

حافظ، پیارے دوست۔''

اس کے جواب میں شکریہ کے طور پر ہاتھی نے پاسپرٹو کو اپنی سونڈ میں اٹھالیا تو پاسپرٹو نے محبت سے اس کے ہلکی سی چپت لگادی۔

پاسپرٹو نے الہ آباد کے بازار سے آؤدا کے لئے انگریزی وضع کے کپڑے خریدے، تاکہ اس لباس میں اسے کوئی پہچان نہ سکے۔

اس واقعہ کے بعد سرفرانسس کو آؤدا کی ہندوستان میں موجودگی سے بڑی تشویش تھی، کیوں کہ ہر لمحہ اسے اس بات کا خطرہ تھا کہ مہاراجہ کے لوگ اسے دوبارہ گرفتار نہ کرلیں۔ فلیس فوگ نے اس بات کا ذمہ لیا کہ وہ آؤدا کو حفاظت سے اس کے رشتہ داروں کے پاس ہانگ کانگ پہنچادے گا۔

الہ آباد میں جب سب ٹرین میں سورا ہونے لگے تو فلیس فوگ نے کہا ''بہت خوب! کیا کام کیا ہے تم نے پاسپرٹو شاباش۔''

فلیس فوگ نے شاید ہی اب تک کسی کی تعریف کی ہوگی۔

ایک ایسے آدمی کی زبان سے یہ الفاظ سن کر پاسپرٹو نے شرماتے ہوئے کہا:

''ارے یہ بھی کوئی بات ہے، جناب!''

ڈبہ میں سب اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے اور ٹرین بنارس کی طرف روانہ ہوگئی۔ آؤدا نے ساتھیوں کو اپنی زندگی کے سارے حالات تفصیل سے بتلائے اور جان بچانے کے لئے سب کا شکریہ ادا کا تو اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل پڑے۔

ساڑھے بارہ بجے ٹرین بنارس کے اسٹیشن پر رکی۔ سرفرانسس نے ٹرین سے اترنے سے پہلے فلیس فوگ کے اس مہماتی سفر کی کامیابی کی تمنا ظاہر کی اور کہا:

''مجھے امید ہے کہ تم شرط جیت جاؤ گے۔'' پھر اس نے فلیس فوگ، آؤدا، اور پاس پرٹو سے ہاتھ ملایا اور ڈبہ سے اتر پڑا۔ ٹرین کلکتہ کے لئے روانہ ہوگئی۔

دوسرے دن صبح 7 بجے ٹرین کلکتہ کے اسٹیشن پہنچ گئی۔ جہاز دوپہر کے بعد روانہ ہونے والا تھا۔ اس طرح فلیس فوگ یہاں وقت سے پانچ گھنٹے پہلے ہی پہنچ گیا تھا۔

کھجور میں اٹکے...

فلیس فوگ، آؤدا اور پاسپرٹو جوں ہی کلکتہ اسٹیشن سے باہر نکلے تو پولیس کے ایک سپاہی نے راستہ روک کر پوچھا: ''کیا تم فلیس فوگ ہو؟''

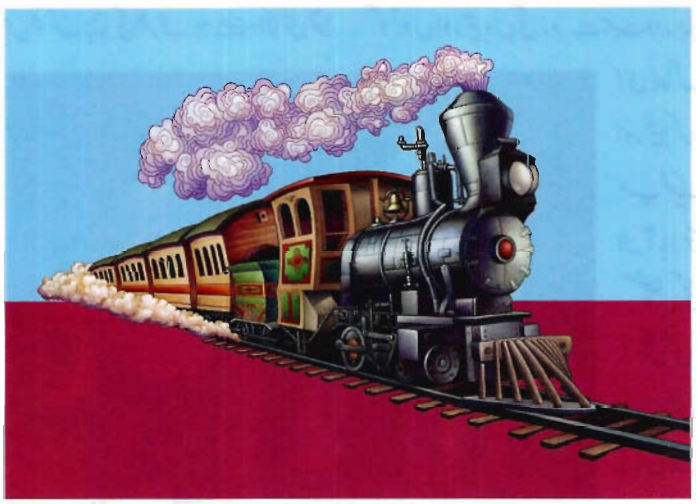

''ہاں۔'' فلیس فوگ نے جواب دیا۔

''کیا یہ تمہارا نوکر ہے؟'' سپاہی نے پاسپرٹو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا:

''جی ہاں۔''

''براہ کرم آپ میرے ساتھ چلیے۔'' پولیس والے نے کہا۔

فلیس فوگ نے کوئی پریشانی ظاہر نہیں کی۔ وہ بالکل پرسکون نظر آرہا تھا لیکن پاسپرٹو چلّانے لگا:

''تم کیا چاہتے ہو؟ اس کا کیا مطلب ہے؟ پہلے مجھے بتاؤ۔''

سپاہی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور آگے کو چلنے کو اشارہ کیا تو فلیس فوگ نے پاسپرٹو کو سپاہی کا حکم ماننے کے لئے کہا۔

پھر فلیس فوگ نے آؤدا کی طرف دیکھتے ہوئے سپاہی سے پوچھا:

''کیا یہ عورت ہمارے ساتھ آسکتی ہے؟''

''ہاں ہاں کیوں نہیں۔'' سپاہی نے جواب دیا۔ پھر اس نے تینوں کو ایک بگھی میں بیٹھنے کے لئے کہا۔ جب سب بیٹھ چکے تو یہ بگھی شہر کی طرف چل پڑی۔ بیس منٹ بعد وہ گھوڑا گاڑی ایک پولیس اسٹیشن کے سامنے آکر رکی تو سپاہی نے ان سے اندر چلنے کے لئے کہا۔ پھر تینوں کو حوالات میں بند کر دیا اور تالا لگاتے ہوئے بولا:

''تمہیں ساڑھے آٹھ بجے جج کے سامنے پیش کیا جائے گا۔''

پاسپرٹو کب خاموش بیٹھنے والا تھا۔ وہ چلایا ''تو آخر ہم پکڑے گئے۔ آسمان سے گرے کھجور میں اٹکے۔'' آؤدا نے فلیس فوگ سے مخاطب ہو کر کہا: ''مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ اس سارے فساد کی جڑ میں ہی ہوں۔ میری وجہ سے ہی پولیس نے تم کو حوالات میں بند کر دیا ہے، یہ صرف اس لئے کہ تم نے مجھے موت کے منہ سے بچایا ہے۔''

جولز ورنے کے اس ناول پر کئی فلمیں بنی اور کامیاب رہی ہیں۔ ایسی ہی ایکشن اینڈ تھرلر فلم کا ایک منظر جس میں آپ فلیس فوگ، پاسپرٹو اور آؤدا کے کرداروں کو دیکھ سکتے ہیں

فلیس فوگ نے آہستہ سے کہا ''صرف ایک عورت کی جان بچانے کی پاداش میں تو قید نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ناممکن ہے۔ ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہوگی۔ ابھی پتہ چل جائے گا۔ آخر قصہ کیا ہے؟''

فلیس فوگ نے آؤدا کو اطمینان دلایا کہ وہ اسے یہاں اکیلا نہیں چھوڑے گا بلکہ کسی نہ کسی طرح اسے ہانگ کانگ لے جائے گا۔

''لیکن جہاز تو 12 بجے روانہ ہوتا ہے۔'' پاسپرٹو بیچ میں بولا۔

فوگ نے اطمینان سے کہا: ''ہم 12 بجے سے پہلے ہی جہاز پر پہنچ جائیں گے۔''

ساڑھے آٹھ بجے حوالات کا دروازہ کھولا گیا۔ سپاہی ان تینوں کو ایک بڑے ہال میں لے گیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک جج آیا اور کرسی پر بیٹھتے ہوئے بھاری آواز میں بولا:

''پہلا مقدمہ پیش ہو۔''

''فلیس فوگ۔'' عدالت کے چپراسی نے پکارا۔

''میں حاضر ہوں۔'' فلیس فوگ نے جواب دیا۔

''پاسپرٹو۔'' چپراسی نے پکارا۔

''حاضر جناب۔''

''ہونہہ'' جج نے گرج دار آواز میں کہا۔ ''ہم پچھلے دو روز سے بمبئی سے آنے والی ٹرین پر تمہارا انتظار کر رہے تھے۔''

''آخر کیوں۔'' پاسپرٹو نے پوچھا ''ہم نے کیا کیا ہے؟''

''ابھی معلوم ہو جائے گا۔'' جج نے کہا: ''گواہوں کو بلاؤ۔''

اسی وقت عدالت کا دروازہ کھلا اور گیروے رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے تین ہندوستانی پنڈت ہال میں داخل ہوئے۔ ان پر نظر پڑتے ہی پاسپرٹو نے دل ہی دل میں کہا: ''اچھا تو یہ قصہ ہے یہ تو وہی لوگ ہیں جو آؤدا کو زندہ جلانا چاہتے تھے۔''

تینوں پنڈت جج کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ منشی نے فردِ جرم پڑھ کر سنائی اور جج کی میز پر جوتے کی ایک جوڑی رکھ دی تو حیرت کے مارے پاسپرٹو کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔ ''میرے جوتے۔'' وہ بمبئی کے مندر کا واقعہ بالکل بھول چکا تھا۔ لیکن عدالت کی پچھلی قطار میں بیٹھے ہوئے سراغ رساں فکس کو سب کچھ اچھی طرح یاد تھا۔ وہ بس پاسپرٹو کو قانون کے شکنجے میں گرفتار دیکھ کر ہی خوش تھا۔ حالاں کہ اس کے پاس فوگ کی گرفتاری کا ابھی تک کوئی وارنٹ لندن کی پولس سے

نہیں آیا تھا۔

''کیا تم نے فردِ جرم سن لی؟'' جج نے پوچھا۔

فلیس فوگ نے اپنی گھڑی کو دیکھتے ہوئے خاموشی سے جواب دیا۔''جی ہاں۔''

''کیا تم اپنے جرم کا اقبال کرتے ہو؟''

''جی ہاں۔''

پھر جج نے فیصلہ سنایا'' 20 اکتوبر کو بمبئی میں مالا بار ہل کے مندر میں جوتے پہنے ہوئے داخل ہونے کے جرم میں تمہیں 15 دن قید کی سزا دی جاتی ہے اور تین سو پونڈ جرمانہ کیا جاتا ہے۔''

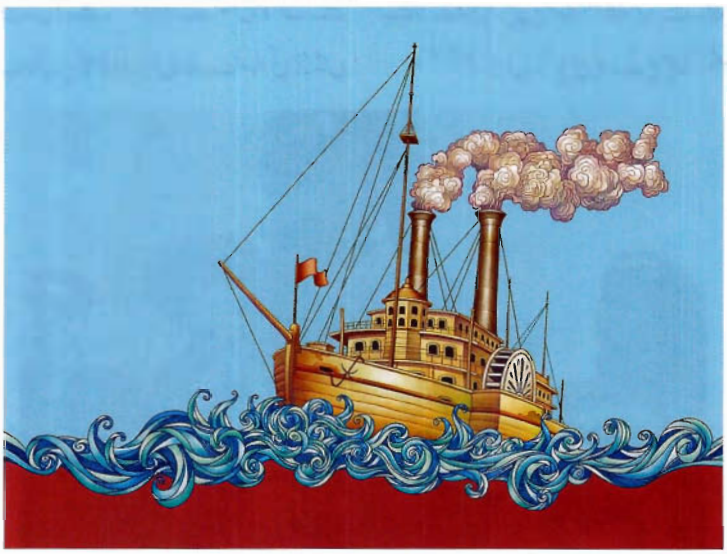

یہ سن کر پاس پرٹو حیرت سے چلا اٹھا: تین سو پونڈ۔''

اس پر جج نے گرج کر کہا:''خاموش۔''

پھر فلیس فوگ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا:''گو اس کا کوئی ثبوت نہیں ملا کہ تمہارا اس جرم سے کوئی تعلق ہے، لیکن چوں کہ تم اس مجرم کے آقا ہو اس لیے اپنے ملازم کی غلطی کا تمہیں بھی خمیازہ بھگتنا بڑے گا۔اس لئے سات دن قید کی سزا اور 150 پونڈ جرمانہ۔''

یہ سن کر سراغ رساں فکس نے اطمینان کا سانس لیا۔آخر اس کی ترکیب کارگر ہو ہی گئی سات دن میں تو گرفتاری کا وارنٹ ضرور آ جائے گا اور وہ یقیناً چور کر پکڑ لے گا۔

قید اور جرمانہ کے الفاظ سن کر تو پاسپرٹو کے ہوش اڑ گئے اور وہ سوچنے لگا کہ یہ تو آقا کی زندگی ہی تباہ ہو گئی۔ جرمانہ تو رہا ایک طرف، اب وہ یقیناً بیس ہزار پونڈ کی شرط ہار جائے گا اور یہ سب صرف اس کی بچکانہ حرکت کی وجہ سے ہوا۔ اگر وہ جوتے پہنے مندر میں نہ جاتا تو اس کے آقا کو آج یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔

فلیس فوگ پر عدالت ک کاروائی کا کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ بالکل مطمئن تھا۔اس کے چہرے پر پریشانی کے کوئی آثار نہیں تھے، جج کا فیصلہ سن کر وہ کھڑا ہو گیا اور کہا:''ضمانت دینے کو تیا ہوں۔''

جج نے کہا:''تمہیں اس کا حق ہے۔لیکن چونکہ تم یہاں اجنبی ہو، اس لئے تمہیں فی کس ایک ایک ہزار پونڈ ضمانت دینی ہوگی۔''

فلیس فوگ نے اپنے سفری بیگ سے دو ہزار پونڈ کے نوٹ نکالے اور جج کی میز پر رکھتے ہوئے کہا:'' یہ لیجئے ضمانت کی رقم۔'' پھر اس نے اپنے ملازم سے کہا:

''چلو، چلیں۔''

پاسپرٹو نے غصہ میں کہا:

'' کیا وہ میرے جوتے واپس نہیں کریں گے؟''

پاسپرٹو کو جوتے واپس دے دیے گئے تو اس نے چلا کر کہا:''اب تو ایک ایک جوتے کی قیمت ایک ہزار پونڈ ہو گئی ہے حالانکہ ان جوتوں نے مجھے کبھی آرام نہیں پہنچایا۔''

فلیس فوگ، آؤدا اور پاسپرٹو عدالت سے باہر نکل آئے اور پھر ایک گاڑی میں بیٹھ کر سیدھے بندرگاہ پہنچ گئے۔ گودی سے آدھا میل دور سمندر میں جہاز 'رنگون' لنگر ڈالے کھڑا تھا۔ گیارہ بج رہے تھے۔ جہاز پر روانگی کا جھنڈا لہرا دیا گیا تھا۔سراغ رساں فکس نے تینوں کو گاڑی سے اتر کر جہاز تک لے جانے والی ایک چھوٹی سی کشتی میں بیٹھتے دیکھا تو بے ساختہ چیخ اٹھا۔''آخر بدمعاش پھر بچ نکلا۔مگر میں بھی دنیا کے آخری سرے تک اس کا پیچھا کروں گا۔'' وہ اپنی ناکامی پر غصہ میں زور زور سے پیر پٹکنے لگا۔جاری□

□ شبنم پروین

دنیا کا سب سے مقبول کھیل

میدان کے کھیلوں میں دنیا کا سب سے مقبول اور سب سے زیادہ ملکوں میں کھیلا جانے والا کھیل فٹ بال یا ساکرSoccer ہے۔ یہاں تک کہ ہندستان میں بھی جہاں ہر کھیل پر کرکٹ چھایا ہوا ہے، اور جس کی ٹیم آج تک ورلڈ کپ فٹ بال مقابلوں میں کوئی جیت حاصل کرنا تو دور رہا ان مقابلوں میں شریک ہونے کے لیے کوالی فائی بھی نہیں کر پائی ہے۔ کرکٹ کے بعد کسی کھیل کو اگر مقبولیت حاصل ہے تو وہ فٹ بال ہے۔ ہندستان کے کسی بھی شہر میں کسی بھی لیول کا کوئی فٹ بال مقابلہ ہوتا ہے تو لوگوں کی بھیڑ اسے دیکھنے کے لیے امڈ آتی ہے۔ ملک کے کچھ حصوں، مثلاً گوآ، کیرالہ، منی پور، ویسٹ بنگال، سکم اور مزورم میں تو فٹ بال کا جنون اور شوق و ذوق کرکٹ کی حدوں کو بھی پار کر جاتا ہے۔

ہندستان میں فٹ بال کی کہانی انیسویں صدی کے وسط سے شروع ہوتی ہے جب بنگال میں انگریز سپاہیوں نے ہندستانی سپاہیوں کو یہ کھیل سکھایا تھا۔ لیکن پہلے فٹ بال کی عالمی تاریخ پر ایک نظر ڈالنا اور یہ جاننا اچھا ہوگا کہ فٹ بال اور ساکر میں کیا فرق ہے۔

بظاہر یہ ایک ہی کھیل کے دو نام ہیں، لیکن دیکھا جائے تو فٹ بال دراصل ہر اس کھیل کو کہتے ہیں جس میں پاؤں اور گیند کا استعمال ہوتا ہو۔ انگلینڈ میں دو طرح کی فٹ بال کھیلی جاتی تھیں۔ رگبی Rugby فٹ بال، جس میں گیند پوری طرح گول نہیں ہوتی اور ایسوسی ایشن فٹ بال جس میں گیند پوری گول ہوتی تھی۔ رگبی کا لفظ رگرrugger (بیضوی یعنی انڈے کی شکل کی گیند) کی عامیانہ صورت ہے۔

اسی طرح ایسوسی ایشن فٹ بال کو لوگ پہلے مختصراً اسوکAssoc کہتے تھے جو بعد میں بگڑ کر سوکر یا ساکر بن گیا، اور یہ ساکر فٹ بال ہی دنیا کا سب سے مقبول کھیل ہے۔ ویسے دنیا کے مختلف خطوں میں مختلف قسم کی، مگر کم وبیش ایک جیسے اصولوں اور ضابطوں کے تحت فٹ بال کھیلی جاتی ہے جس میں امریکن فٹ بال، آسٹریلین فٹ بال، کینیڈین فٹ بال، گالک Gaelic فٹ بال۔ رگبی لیگ، رگبی یونین شامل ہیں۔

فیفا ورلڈ کپ
برازیل

جہاں تک تاریخ کی بات ہے تو دنیا بھر میں پاؤں کی ٹھوکر سے کھیلے جانے والے کھیلوں کے بہت سے تاریخی حوالے ملتے ہیں۔ قدیم یونان اور روم میں سن 388 قبل مسیح سے لے کر سن 43 ق م تک کے

مختلف ادوار میں مختلف اقسام کے فٹ بال سے ملتے جلتے کھیلوں کا ذکر ملتا ہے اور پتھر پر تراشی گئی کچھ تصاویر میں کسی کھلاڑی کو اپنی ران کے اوپر ایک فٹ بال بیلنس کرتے ہوئے بھی دکھایا گیا ہے۔ یونان میں اس کھیل کا نام فائی نندا phaininda تھا تو روم میں یہ ہارپستم harpastum کہلایا۔ اسی زمانے کے آس پاس چین میں فٹ بال سے ملتے جلتے کھیل سوجو cuju کا ذکر ملتا ہے جس کا صحیح ترجمہ ہوگا کِک بال cick ball۔ اسی طرح کوریا میں چک گک chuk-guk اور جاپان میں کیماری کا کھیل ہوتا تھا۔ ہندوستان میں ایسے کسی کھیل کا واضح ذکر کسی بھی تاریخی کتاب میں نہیں ملتا لیکن کرشن جی سے منسوب جو کہانیاں مشہور ہیں ان میں جمنا کے کنارے بچوں کے گیند سے کھیلنے کا اور پھر گیند کے جمنا میں اس جگہ گر جانے کا ذکر ملتا ہے جہاں ہزار پھنوں والا سانپ 'شیش ناگ' رہتا تھا۔ کرشن جی تب بچے تھے اور جمنا میں بے خطر کود کر گیند کو باہر نکال لائے تھے۔ کوئی نہیں جانتا وہ کون سا کھیل تھا لیکن تعجب نہیں اگر وہ فٹ بال کی ہی قسم کا کوئی پاؤں کی ٹھوکر سے کھیلا جانے والا کھیل رہا ہو۔ اگر یہ صحیح ثابت ہوتا ہے تو چونکہ کرشن جی کا زمانہ یونانی تاریخ سے بھی پہلے کا ہے، اس لیے اسے فٹ بال کا سب سے پرانا حوالہ مانا جائے گا۔ تاہم واضح رہے کہ یہ محض ایک اندازہ ہے۔ دنیا کے سبھی علاقوں میں پھیلی ہوئی فٹ بال کی اس تاریخ سے بہرحال اتنا ضرور سمجھ میں آجاتا ہے کہ یہ دنیا کا سب سے مقبول کھیل کیوں ہے۔

ہندستان میں فٹ بال کو اس کی موجودہ شکل میں انگریز ضرور لے کر آئے تھے لیکن اسے عوامی مقبولیت صرف ایک شخص، کلکتہ کے نگیندر پرساد سرودھیکاری کی بدولت ملی، جنھیں ہندوستان کا بابائے فٹ بال بھی کہا جاتا ہے۔ انھوں نے 1877 میں شمالی کلکتہ کے ہیئر اسکول میں اپنے ہم جماعتوں کو فٹ بال کھیلنے پر آمادہ کیا، آس پاس کے انگریزی اسکولوں کی مدد سے فٹ بال کے مقابلے کرائے اور برصغیر میں پہلا فٹ بال کلب ویلنگٹن کلب کے نام سے بنایا۔ اس کے بعد انھوں نے سووا بازار sova bazar کلب کی بنیاد رکھی۔ بعد کے برسوں میں کئی اور کلب بنے جن میں موہن بگان، محمڈن اسپورٹنگ، ایسٹ بنگال، آریئنز Aryans، اسپورٹنگ یونین، کالی گھاٹ اور راجستھان کلب شامل ہیں۔ اتنے سارے کلبوں کی موجودگی میں 1893 میں کلکتہ ہی میں انڈین فٹ بال ایسوسی ایشن قائم ہوئی جس نے فٹ بال ٹورنامنٹ شروع کرائے، اور جیتنے والی ٹیم کو آئی ایف اے شیلڈ دینے کا سلسلہ شروع ہوا۔ انھی دنوں ڈیورنڈ مقابلوں کا بھی آغاز ہوا جو آج تک چلے آرہے ہیں۔ لیکن شروع میں ان مقابلوں میں صرف انگریزوں کی ٹیمیں جیتتی رہیں۔ ہندوستانی ٹیموں میں سب سے پہلے موہن بگان ایتھلیٹک کلب نے 1911 میں آئی ایف اے شیلڈ حاصل کی جس سے اسے زبردست شہرت ملی اور بنگال میں فٹ بال کو ایک طرح سے قومی کھیل کا درجہ حاصل ہوگیا۔

عالمی پیمانے پر فٹ بال شروع سے اولمپک کھیلوں میں شامل رہی لیکن اس کی الگ عالمی تنظیم 1904 میں فیڈریشیوں انٹرنیشنل ڈی فٹ بال ایسوسی ایشنز Federation Internationale de Football Associations یا فیفا FIFA کے نام سے قائم ہوئی جس کا صدر دفتر زیورخ (سوئٹزرلینڈ) میں ہے اور پوری دنیا کے 208 ملک اپنی قومی فٹ بال فیڈریشنوں کے تعلق سے اس کے ممبر ہیں۔ ہر چار سال بعد یہ فیڈریشن ایک عالمی کپ فٹ بال ٹورنامنٹ کراتی ہے جسے دنیا کے اربوں لوگ ٹیلی ویژن پر دیکھتے ہیں۔

ایک عجیب و غریب سچائی اس مقابلے میں ہندستان کے غائب رہنے کے تعلق سے یہ ہے کہ اگرچہ ہندستانی ٹیم آج تک اس میں نہیں کھیل پائی ہے لیکن 1950 کے فیفا کپ میں اسے باقاعدہ تیسرے گروپ میں اٹلی، پیراگوئے اور سویڈن کے ساتھ شامل کرلیا گیا تھا۔

اس کے باوجود ہماری ٹیم آل انڈیا فٹ بال فیڈریشن کی کوتاہ اندیشی اور بے وقوفی کی وجہ سے اس عالمی مقابلے میں شریک نہیں ہو پائی۔ پورا قصہ کم لوگ جانتے ہیں۔ ہوا یہ تھا کہ دوسری عالمی جنگ کی وجہ سے فیفا کے 1942 اور 1946 کے مقابلے منعقد نہیں ہو پائے تھے اور اب 1950 میں 12 سال بعد یہ مقابلے برازیل میں ہونے والے تھے۔ اس وقت فیفا کے متعدد ممبر ملک عالمی جنگ کی تباہ کاریوں کی وجہ سے بری حالت میں تھے اور انھوں نے عالمی مقابلے میں شرکت سے ہاتھ کھینچ لیے تھے۔ اس کے علاوہ جرمنی، ہنگری، چیکوسلو واکیہ سمیت بہت سے ملکوں پر پابندی لگی ہوئی تھی۔ ایشیا میں بھی فلپائن، انڈونیشیا اور برما مقابلے سے ہٹ گئے تو ہندستان کی ٹیم کچھ کیے بغیر ہی فیفا کپ کے لیے کوالیفائی کر گئی۔ لیکن ہندوستانی ٹیم کے منتظمین نے اس حسنِ اتفاق کو ذرا بھی اہمیت دیے بغیر فیفا سے بہانہ بنا دیا کہ برازیل کے لمبے سفر اور وہاں قیام پر بہت رقم خرچ ہوگی جو اس کے پاس نہیں ہے۔ فیفا نے جواب دیا کہ وہ خرچ کا بڑا حصہ خود برداشت کرنے کو تیار ہے لیکن منتظمین اولمپک کے آگے فیفا کے مقابلے کو کوئی اہمیت ہی نہیں دے رہے تھے۔ انھوں نے برازیل جانے کی کوئی تیاری نہیں کی اور ہندستانی فٹ بال شائقین کو یہ جھوٹ بول کر گمراہ کر دیا کہ فیفا نے ننگے پاؤں فٹ بال کھیلنے پر پابندی لگا دی ہے جبکہ انھیں معلوم تھا کہ آئندہ اولمپک میں بھی یہ پابندی نافذ کر دی جائے گی۔ وہ دن ہے اور آج کا دن، ہندستانی ٹیم فیفا میں کھیلنے کے لیے کبھی کوالیفائی نہیں کر پائی۔ نتیجہ اس کا یہ ہے 1930 سے اب تک ہونے والے تمام فیفا مقابلوں سے ہندوستان اس کا ممبر ہونے کے باوجود باہر ہے۔

بہرحال ہندوستانی فٹ بال کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو 1951 سے 1962 تک کا زمانہ اس کے لیے سنہرا دور ثابت ہوا۔ اس زمانے میں ہندستانی فٹ بال ٹیم کے کوچ سید عبدالرحیم تھے جن کی نگہبانی اور تربیت میں ٹیم نے 1951 اور 1962 کے ایشیائی کھیلوں میں فٹ بال کے گولڈ میڈل حاصل کیے اور 1956 کے ملبورن اولمپک میں ہماری ٹیم چوتھے نمبر پر رہی۔ مرڈیکا کپ اور کواڈرینگولر ٹورنامنٹ (چار ملکی مقابلے) میں بھی ہم نے کامیابی حاصل کی۔ لیکن 11 جون 1963 کو سید عبدالرحیم کے انتقال کے بعد انٹرنیشنل مقابلوں میں ہماری ٹیم پھر نچلی سطح پر آ گئی۔ 1964 میں فٹ بال کے پہلے ایشیائی کپ ٹورنامنٹ کے لیے ہم نے کوالیفائی تو کر لیا لیکن فائنل نہیں جیت سکے۔ ایشیائی کھیلوں میں بھی ہماری آخری جیت 1970 میں ہوئی جب ہم نے جاپان کو ہرا کر بمشکل کانسے کا تمغہ حاصل کیا تھا۔

سید عبدالرحیم کوچ

ہندستانی فٹ بال کے بہترین کھلاڑیوں میں گوستھا پال، سوبی مل چونی گوسوامی، سیلن منا، پی کے بنرجی، پیٹر تھنگ راج اور جرنیل سنگھ ڈھلوں کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ موجودہ دور کے بہترین کھلاڑیوں میں آئی ایم وجین، بیچونگ بھوٹیا، سنیل چھیتری، کلائمکس لارینس، مہیش گاولی اور شن موگم وینکٹیش سے امید کی جا سکتی ہے کہ ان میں سے وہ کھلاڑی جو اب بھی کھیل رہے ہیں ہماری فٹ بال ٹیم کو آگے لے جائیں گے۔

ہندستانی فٹ بال کی ابتری کی کئی وجہیں بتائی جاتی ہیں جن میں ایک ہے سرمائے کی کم فراہمی۔ آخر اب بہت دیر سے تجارتی گھرانوں کو اس کا خیال آیا ہے اور 'سہارا' جیسا بڑا گروپ فٹ بال کی ترقی کے لیے آگے آیا ہے۔ اتفاق دیکھیے کہ فیفا کا اگلا ورلڈ کپ 2014 میں ایک بار پھر اسی برازیل میں ہو رہا ہے جہاں 1950 میں ہمیں کھیلنے کا موقع ملا تھا۔ یہ اگلے سال 12 جون سے 13 جولائی تک ہوگا مگر ہم اب بھی اس سے باہر ہوں گے۔ □

♦ شبنم پروین 2nd Flr C280 شاہین باغ جامعہ نگر، نئی دہلی 110025

یہ مزے مزے کی حکائتیں...

کیا آپ کے پاس موبائل فون ہے؟ اگر ہاں تو اس پر اپنے دوستوں اور ممّی ڈیڈی کو ایس ایم ایس SMS یعنی شارٹ میسیج / میسیجنگ Short Message/Messaging Service سے پیغام بھی ضرور بھیجتے ہوں گے۔ یہ لفظ SMS ہے تو دراصل ایک سروس لیکن اس کا استعمال اتنا بڑھ گیا ہے کہ اب اسے موبائل پر بھیجے گئے پیغام کا ہم معنی سمجھا جانے لگا۔ خیر ہمیں نام سے کیا، ہمیں تو پیغام سے کام ہے۔ آپ کی طرح ہمیں بھی دوستوں کے ایس ایم ایس ملتے ہیں، اور وہ ایس ایم ایس ہمیں بہت ہی اچھے لگتے ہیں جن میں چٹکلے اور دوسری مزے دار باتیں لکھی گئی ہو۔ ان صفحات پر ہم نے آپ کی دل چسپی کے لیے ایسے ہی مزے دار اردو ایس ایم ایس یہاں وہاں سے اکٹھے کئے ہیں۔ آپ چاہیں تو خود بھی ہمیں ایس ایم ایس کر سکتے ہیں۔ بس تو سوچیے کوئی مزے دار بات یا لطیفہ، اور اس نمبر پر ہمیں بھیج دیجیے۔ نمبر ہے: 9716145593
آپ کا میسیج مزے دار ہوا تو ہم اسے ان صفحات کا حصہ بنالیں گے۔ لیکن اپنا اور شہر کا نام لکھنا ہرگز نہ بھولیے! مدیر

◆ والد ٹیچر سے: میرا بیٹا تاریخ میں کیسا ہے؟ کیوں کہ میں تو تاریخ میں بہت کمزور تھا۔

ٹیچر: بس تو پھر یوں سمجھ لیجیے کہ تاریخ خود کو دوہرا رہی ہے۔

نجیب احمد، کولکاتا

◆ جو دوست اپنی جیب سے اپنے دوستوں کو پارٹی دیتا ہے، کامیابی ہمیشہ اس کے قدم چومتی ہے۔

تو ہے کوئی پروگرام؟

عبداللہ عثمانی، مالیگاؤں، مہاراشٹر

◆ ڈاکٹر پاگل سے: تم پاگل کیسے ہوئے۔

پاگل: میں نے ایک بیوہ عورت سے شادی کر لی۔ اس کی ایک جوان بیٹی تھی۔ اس سے میرے باپ نے شادی کر لی۔ یوں میری بیٹی میری ماں بن گئی۔ ان کی ایک بیٹی ہوئی تو وہ حالانکہ میری بہن تھی مگر میں اس کی نانی کا شوہر تھا اس لیے وہ میری نواسی بھی ہوئی۔ اسی طرح میرا بیٹا اپنی دادی کا بھائی بن گیا اور میں اپنے بیٹے کا بھانجا اور میرا باپ میرا داماد بن گیا میرا بیٹا اپنے دادا کا سالا بن گیا اور...

ڈاکٹر سر کے بال نوچتے ہوئے: ابے چپ ہو جا بس۔ اب کیا مجھے بھی پاگل کرے گا؟

محمد ثناالرحمٰن، آسنسول۔ بردوان، ویسٹ بنگال

◆ ایک راز...

صرف ہم دونوں کے بیچ رہنا چاہیے

پلیز کسی کو بولنا مت

پرامس Promise

انڈیا کا میپ خریدنے سے

سری لنکا کا نقشہ مفت میں مل جاتا ہے

افشین، اورنگ آباد

♦ سینے میں دل
دل میں درد
درد میں یقین
یقین میں خیال
خیال میں خواب
خواب میں تصویر
تصویر میں صرف آپ
اتنا ڈراؤنا خواب
باپ رے باپ!!

شیز اعلی، اورنگ آباد

♦ ایک لمبی داڑھی والے مولوی صاحب سائیکل پر کہیں جا رہے تھے کہ ایک خاتون سے ٹکرا گئے۔ وہ خاتون بولیں ''واہ مولوی صاحب! اتنی لمبی داڑھی رکھے ہوئے ہیں اور دوسروں سے ٹکراتے پھر رہے ہیں۔ شرم نہیں آتی آپ کو؟''
مولانا بولے ''بیٹی! معاف کرنا۔ یہ داڑھی ہے بریک نہیں۔''

♦ ایک شرابی نشے میں رات گئے اپنے گھر پہنچا۔ اس نے چابی تالے میں ڈالنے کی کوشش کی لیکن چابی تالے میں نہیں جا رہی تھی۔ ایک پڑوسی نے شرابی سے کہا ''لاؤ چابی مجھے دو میں تالا کھول دیتا ہوں۔''
اس پر شرابی نے کہا ''تالا تو میں کھول لوں گا، تم ذرا دیوار کو پکڑ کر رکھو، یہ بہت زیادہ ہل رہی ہے۔''

♦ ایک جیب کترے نے دوسرے جیب کترے کے ہاتھ میں تسبیح دیکھ کر اپنی حیرت ظاہر کی اور پوچھا ''کیا اپنے پیشے سے توبہ کر لی؟''
''نہیں یار!'' دوسرے جیب کترے نے منہ بسورتے ہوئے کہا ''ابھی ابھی غلطی سے ایک مولوی کی جیب میں ہاتھ پڑ گیا تھا۔''

♦ ایک آدمی جنگل سے گزر رہا تھا کہ ایک شیر سامنے آ گیا۔ شیر نے کہا ''آج میں تمھارا خون پی جاؤں گا۔''

آدمی بولا ''میرا خون تو ٹھنڈا ہے۔ پیچھے ایک نوجوان آ رہا ہے۔ اس کا خون گرم ہے۔ وہ خون پینا۔''
شیر نے کہا ''نہیں، آج میرا دل کولڈ ڈرنک کو چاہ رہا ہے۔''

♦ ایک جج آنکھوں سے بھینگا تھا۔ اس کے سامنے تین ملزموں کے مقدمے لائے گئے۔ جج نے ایک ملزم سے پوچھا ''تمھیں اپنے اوپر لگائے گئے الزام پر کیا کہنا ہے؟''

دوسرے ملزم نے کہا ''میرا کوئی قصور نہیں ہے۔''
جج نے کہا ''میں تم سے بات نہیں کر رہا ہوں۔''
''مگر میں نے تو کچھ کہا ہی نہیں۔'' تیسرے ملزم نے کہا!

♦ دو شرابی رات کے اندھیرے میں پیڑ کے نیچے بیٹھے تھے۔ ایک شرابی نے اپنی ٹارچ اوپر کے جلائی تو اس سے روشنی ایک لائن بن گئی۔ اس نے دوسرے شرابی سے کہا کہ کیا تم اس لائن پر چڑھ سکتے ہو؟ دوسرے شرابی نے کہا یہ کون سا مشکل کام ہے۔ پہلے شرابی نے کہا یہ بات ہے تو چڑھ کر دکھاؤ۔ دوسرا شرابی بولا ''اب اتنا بھی بے وقوف نہیں ہوں میں۔ میں جیسے ہی اوپر چڑھوں گا تم ٹارچ بجھا دو گے۔'' □

میں نے اردو اختیاری مضمون کے طور پر لی ہے

میں سید فرقان معظم، حیدرآباد کے میسکو گریڈز ہائی اسکول میں چوتھی جماعت میں پڑھتا ہوں۔ اس وقت میری عمر 9 سال ہے۔ جب میں اور چھوٹا تھا تب میرے دادا ابو مجھے کہانیاں سناتے تھے اور چھوٹی چھوٹی نظمیں بھی یاد کرواتے تھے۔ اسی وقت سے مجھے اردو سیکھنے اور لکھنے پڑھنے کا شوق ہوا۔ میں نے اپنے اسکول میں اردو اختیاری مضمون کے طور پر لی ہے۔ مجھے ٹی وی پر کارٹون دیکھنے کا بہت شوق ہے۔ میرے پاس بچوں کا جو میگزین آتا ہے اس میں بہت کم کارٹون کہانیاں ہوتی ہیں جبکہ میں زیادہ سے زیادہ پڑھنا چاہتا ہوں۔ اور ایک بات یہ کہ انگلش میں نظم والی کارٹون کہانیاں میں نے پڑھی ہیں، ایسا اردو میں بھی ہونی چاہیے۔ یہ میرے لیے افسوس کی بات ہے کہ اردو میں کامکس کہانیوں کا الگ سے کوئی رسالہ نہیں نکلتا۔

سید فرقان معظم، معرفت رؤف خلش، ہاؤس نمبر 16-8-544 داؤد منزل، نیو ملک پیٹ، حیدرآباد۔ 500024

کامکس اور کہانیاں اچھے لگتے ہیں!

میں سید مروان مکرم، تیسری جماعت میں پڑھتا ہوں اور میرے اسکول کا نام، الفاظ انٹرنیشنل اسکول (حیدرآباد) ہے۔ اور ہاں، میری عمر 8 سال ہے۔ انٹرنیٹ پر ٹام اور جیری اور ڈورومن کے کارٹون جب ہم بھائی بہنیں دیکھتے تھے تو ہمارے ابو نے کچھ کارٹون کتابیں بھی لا کر دیں جنھیں پڑھنے کا الگ مزہ آیا۔ اسکول میں اردو سبجیکٹ لینے کے بعد اردو کہانیوں کی کتابیں پڑھنے کا بھی شوق شروع ہوا۔ ہمارے ابو کے پاس ایک پرانے اردو میگزین 'کھلونا' کی بہت سی کاپیاں ہیں جن میں کافی اچھی کارٹونی کہانیاں ہیں مگر وہ رنگین نہیں ہیں۔ میرے ابو جناب مکرم نیاز ہیں جنھوں نے ایک بہت ہی خوب صورت ویب سائٹ اردو جاننے والے بچوں کے لیے کامکس کارٹونوں کی بنائی ہے۔ اس پر انگریزی کے بہت سے مشہور کامکس مجھے اردو میں پڑھنے کو مل جاتے ہیں۔ ہماری خواہش ہے کہ 'بچوں کی دنیا' میں اچھی اچھی رنگین اور مزیدار سبق آموز کہانیاں پڑھنے کو ملتی رہیں۔

سید مروان مکرم، معرفت مشتاق احمد، ہاؤس نمبر 18-12-418/D/70 حافظ بابا نگر، کنچن باغ، حیدرآباد۔ 500058

ہمارے سب استاد اردو جانتے ہیں

میرا نام ظریفہ خان ہے۔ میں نے بچوں کی دنیا کا پہلا اور دوسرا شمارہ دیکھا۔ مجھے یہ میگزین بہت بہت اچھا لگا، اس میں ہمارے لیے بہت ساری کام کی باتیں ہیں۔ میں سرسید میموریل اسکول، کرما، گیا میں درجہ 7 میں پڑھتی ہوں جو ایک اردو میڈیم اسکول ہے لیکن اس میں انگریزی کی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ ہمارے اسکول میں سبھی استاد اچھی اردو جانتے ہیں۔ مجھے بہت خوشی ہے کہ آپ سب نے اتنا خوبصورت رسالہ ہم بچوں کو تحفے میں دیا ہے۔ میں پہلے سے امنگ اور پیام تعلیم کا مطالعہ کرتی رہی ہوں۔ مجھے بچوں کی دنیا میں اچھی اچھی تصویریں، کہانیاں، عام معلومات بہت پسند آئیں۔

ظریفہ خان، کیئر آف عبدالوہاب خان، بیری، پیسرا، گیا، بہار